چشم حیراں

احمد جمال پاشا

نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دلی 110025

چشمِ حیراں

(طنزیے مزاحیے)

احمد جمال پاشا

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار:۔

صدر دفتر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار ۱۹۷۸ء تعداد ۷۵۰ قیمت:۔

(جمال پرنٹنگ پریس دہلی)

مجتبیٰ حسین کے نام

فہرست

چشمِ حیراں

حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟ بقول تین بندروں کے ـــــ نہ دیکھو بُرا، نہ سُنو بُرا، نہ کہو بُرا۔ یعنی آنکھیں، کان، منھ، سب بند ٹکٹک دیدم، دم نہ کشیدم۔

یقین جانیے، دَور وہ کہ آنکھوں سے کام لوں تو سلائی پھر جائے، سننے پہ آؤں تو سماعت زائل ہو جائے۔ منھ کھولوں تو بند ہو جاؤں، پھر بھی ممکنہ دیدنی و گفتنی سے گر کچھ سمجھ یا سمجھا سکتا ہوں، تو یہ کہ بُرے کو دیکھوں یا اچھے کو، حیرانی نہیں جاتی کہ سب دھان بائیس پنسیری کے۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا پارسا کیا شیطان، عالم ہوں یا اسمگلر، ناقد ہوں یا ڈنڈی مار، دانشور ہوں یا رجعت پرست، سیاست داں ہوں یا جرائم پیشہ، امتیاز ناممکن۔ کردار، قول و فعل، عمل، مثلِ اعمالی ندارد۔ جس مال کے تاجر وہی مال ندارد۔ سب خلق کے لیے باعثِ حیرانی۔

حیرانی وجہ پریشانی جس کا اظہار کہیں طنز و مزاح کے پردے میں، کہیں تحریف، خاکے یا خیال آرائی کے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ لگا ہے ڈھکے چھپے، لگا ہے کُھلم کُھلا۔

حیرانی طنز و مزاح کی تعریف یہ بھی ہے کہ اس کا سلسلہ مولانا حالی سے آج تک جاری و ساری ہے۔ طنز و مزاح کی تعریف نہ ہوئی، اس کے گناہ گناروں کے لیے عذابِ قبر ہو گئی، جس کا سلسلہ حشر تک تو ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

حیرانی اس پہ ہے کہ جس طرح تاش کی گڈی پھینٹ کر نئی ٹریل بنائی جاتی ہے۔ اسی طرح پُرانی تعریفیں پھینٹ کر نئی تعریف تصنیف کر لی جاتی ہے۔ جن کے چکر میں اچھا بھلا مزاح نگار راشد الخیری بن سکتا ہے۔ مگر جانشین پطرس نہیں ہو سکتا۔

مزاح نگاری سے توبہ کر کے: انشا پرداز یا نوحہ گر ہو سکتا ہے۔ انشا و نوحۂ فن

ہیں۔ طنز و مزاح بھی فن ہے۔ پر راہیں جدا جدا منزل الگ الگ۔

حیرانی طنز و مزاح پہ تنقیدیں پڑھ کے دوبالا ہو جاتی ہے۔ جو حسبِ ذیل قسم کی ہوتی ہیں:

"وہ پہلے بہت زیادہ لکھتے تھے ــــ اب بہت کم لکھتے ہیں ــــ پہلے زیادہ لکھتے تھے ــــ اب کم لکھتے ہیں ــــ پہلے کم لکھتے تھے ــــ اب زیادہ لکھتے ہیں ــــ برابر لکھتے رہتے ہیں ــــ برابر لکھتے ہی رہتے ہیں ــــ بہت لکھتے ہیں ــــ تقریباً لکھتے رہتے ہیں ــــ کم لکھتے ہیں ــــ گاہے گاہے لکھتے ہیں ــــ جب دل چاہتا ہے لکھتے ہیں ــــ لکھتے لکھاتے ہی رہتے ہیں ــــ یہ بھی لکھتے ہیں ــــ یہ کیوں لکھتے ہیں؟ ــــ یہ کیوں نہیں لکھتے؟؟"

حیرانی اس بات پہ ہے کہ یہ کوئی کسی کے بارے میں نہیں لکھتا، کہ وہ کیا لکھتا ہے؟

حیرانی لکھتے رہنے پہ بھی ہے۔ قسم لے لیجیے جو ان میں سے ایک مضمون بھی کبھی میں نے لکھا ہو ــــ یہ مضامین یا تو مجھ سے جبراً لکھوائے گئے ہیں، یا مجھ پر نازل ہوئے ہیں۔ اس میدان کو چھوڑنے کی بارہا میں نے بڑی سنجیدگی سے کوشش کی ہے مگر میدان مجھے چھوڑنے پہ تیار نہ ہو سکا۔ دوستوں اور اڈیٹروں، بلکہ اڈیٹر نما دوستوں نے سالناموں اور خاص نمبروں کی فرمائشوں سے ہر بار گھراؤ کر کے میدان میں پسپا کر دیا۔

چشمِ حیراں کی وجہ تسمیہ یہی حیرانی ہے۔ جس میں احباب کا خلوص اور زمانے کی تڑپ شامل ہے۔ دونوں کی پرچھائیاں اس میں آپ کو ملیں گی۔

چشمِ حیراں کے مضامین اگر آپ کو پسند آئے، تو اسے اپنا اقبال سمجھوں گا۔ اگر تحریری یا زبانی، کھلے بندوں یا پرائیویٹ طور پر سراہا تو۔ اسے انعام تصور کروں گا۔ اگر تنقید سے طنز یا تعریض پہ اتر آئے تو اس لیے مطمئن ہو جاؤں گا کہ آپ خود مزاح نگار ہیں۔ لہٰذا ان تمام حیرانیوں کے ساتھ اس بکری کے بچے کو نقادانِ فن کے قصائی باڑے کے سپرد کرتا ہوں کہ ع سپردم بتو مایۂ خویش را؛ تو دانی حساب کم و بیش را

احمد جمال پاشا

سڑک کے گڑھوں سے انٹرویو

جب میں اپنے اخبار کی جانب سے بارش اور سیلاب کے بنائے ہوئے آدم خور گڑھوں سے انٹرویو کے لیے ایک ہاتھی ڈوباؤ گڑھے کے پاس رُکا اور اس میں الٹے ہوئے ایک ٹرک کے بارے میں پوچھا۔

”بھئی گڑھے اتنا بڑا ٹرک تم نے کیسے اُلٹ دیا؟“

پہلے تو گڑھا ایک کھڑکھڑیا یکہ کی طرح ہنسا، پھر بولا۔

”یہ تو بے چارا ایک معمولی ٹرک ہے، میں تو اب اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ ٹرک کیا پوری ٹریفک تک کو گرا سکتا ہوں۔“

میں نے بے حیائی اور مہنگائی کی طرح بڑھتے ہوئے اس گڑھے سے پوچھا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم ہمیشہ سے اتنے ہی عظیم گڑھے ہو؟“ ـــــ گڑھے نے دانشورانہ انداز میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”میاں صاحبزادے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ابھی میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی سڑکوں کے گڑھے نہیں دیکھے۔ ورنہ مجھے عظیم گڑھا سمجھنے کی غلطی نہ کرتے۔ ارے بھئی میں تو بے چاری پی ڈبلیو ڈی کا ایک معمولی گڑھا ہوں۔ میں تو ٹاؤن ایریا کی سڑکوں کے گڑھوں تک سے چھوٹا ہوں۔“ بارش اور سیلاب نے مجھے ضرور اتنا لمبا چوڑا بنا دیا ہے کہ پاٹے نہ پٹ سکوں۔ مگر مجھے وہ اپنا بچپن کا زمانہ یاد ہے۔ ۔ ۔ ۔ ”یہ کہہ کر بوڑھا گڑھا رُک سا گیا اور ایک فلمی مصرعہ ع بچپن کے دن بھلا نہ دینا۔

گنگنانے کے بعد بولا ــــــ "کسی بہت بڑے لیڈر کی ہمارے شہر میں آمد کے موقع پر سڑک پر بلّیاں گاڑ کر جھاٹک سجانے کے بہانے مجھے پیدا کیا گیا تھا۔ لیڈر تقریر کر کے چلا گیا۔ بانس بلّیاں بھی اُتر گئیں۔ مگر ان سے پیدا ہونے والے اس ناچیز گڑھے کی طرف کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ اس زمانے میں میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھ سے ٹھوکر کھانے والے راہ گیر تک نہیں گر پاتے تھے۔ مگر اب میں اتنا بڑھ چکا ہوں کہ ٹرک تک گرا لیتا ہوں۔ اگر مجھ میں پانی اسی طرح بھرا رہے تو انسان تو انسان ہاتھی تک ڈوب جائے اور اس میں مچھلیاں تو مچھلیاں مگرمچھ تک پالے جا سکتے ہیں ـــ" ــــ میں نے پوچھا۔

"اے پی ڈبلو ڈی کے گڑھے، مگر یہ تم ہیں، مگرمچھ پالنے کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے"؟ گڑھے نے کہا۔

"یہ جو گڑھے پیدا کرنے والے لیڈر سڑکوں کی حالت زار پر مگرمچھ کے آنسو بہایا کرتے ہیں، ان کے لیے آنسو فراہم کرنے کے واسطے ـ"

اس کے بعد میں آگے بڑھ گیا۔ ایک اور گڑھا جو شاید ہماری باتیں بڑی دلچسپی سے سُن رہا تھا اور مُنھ پھاڑے میرا منتظر تھا۔ مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے بڑی حسرت سے بولا۔

"کیا اندر تشریف نہیں لائیے گا؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "نہیں بھئی بس دور ہی سے سلام دعا ٹھیک ہے" اس نے کہا۔

"کیا میری نہیں سُنیے گا؟ میں اس گڑھے کے سرے پر رُک گیا جو کنوئیں کی طرح گہرا تالاب کی طرح چوڑا اور سڑک کی لمبائی میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے کہا جلدی سے آپ بھی اپنی رام کہانی سُنا دیجیے۔" اس خونخوار گڑھے نے کہا۔

"پہلے آپ میرے اندر جھانکنے کی کوشش کیجیے۔ میری روح ـــ" میں نے اس کی آتما میں جھانکا تو دیکھا کہ اس گڑھے نما غار میں بہت سی ٹرکوں، موٹروں، تانگوں، یکّوں، رکشوں اور راہ گیروں کے انجر پنجر نظر آئے۔ میں نے اس آدم خور گڑھے سے پوچھا۔

"کیا تمھاری کبھی مرمت نہیں ہوئی؟"——

گڑھے نے کہا—"بہت مرمت ہوئی—"

"تو کیا تم اب اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ پاٹے نہ پٹ سکو؟"— گڑھے نے کہا—"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو ایک اشارے میں پٹ سکتا ہوں—"

"پھر؟" گڑھے نے جواب دیا۔

"دراصل میں وہ گڑھ نہیں، جسے چیونٹے کھاسکیں۔ میں کوئی ایرا غیرا گڑھا تو ہوں نہیں۔ میں نگر مہا پالیکا کا گڑھا ہوں۔"

"آخر میونسپلٹی تم کو پاٹتی کیوں نہیں؟"

"میونسپلٹی تو جناب مجھے ہر سال بہت پابندی سے پاٹتی ہے— مگر صرف اپنی فائلوں میں—"

اس نے فخر سے کہا—

"آج تک میرے کنوارے سینے پر میونسپلٹی کا انجن نہیں چلا۔ اتنا بڑا ہونے کے بعد بھی آج تک میں نے ڈھکل کی سیٹی نہیں سُنی، دُرمٹ کی شکل نہیں دیکھی اور نہ تارکول کی چادر اوڑھی—"

گڑھے نے ہنستے ہوئے کہا—"فائلوں اور بیانات سے آج تک کوئی گڑھا نہیں پاٹا جاسکا۔"

میں نے اس کی بات سے سوفی صد اتفاق کرتے ہوئے اجازت چاہی اور آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک اور گڑھے سے بات چیت کے لیے رُکنے لگا۔

گڑھے نے کہا—"معاف کیجیے گا۔ شاید آپ اس غلط فہمی میں رُک گئے۔ کہ میں کوئی گڑھا وڑھا ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں، میں فقط ایک مین ہول ہوں—"

میں نے کہا—"اگر آپ مین ہول ہیں، تو پھر آپ کا ڈھکن کیا ہوا؟ مین ہول نے کہا۔

"جنھوں نے مجھے کو ڈھاکا تھا وہی ننگا بھی کر گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے۔ میونسپلٹی والے اُٹھا لے گئے۔"

"یہ کیسے؟"

"یہ بالکل ایسے ہی جیسے کہ بجلی کے تار چُرانے میں بجلی والے دھر لیے جاتے ہیں اور ٹیلی فون والے ٹیلی فون کے تار کاٹ لے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بس بس یَن ہول صاحب، میں سمجھ گیا۔ مگر اس طرح تمھارے اندر کسی آدمی کے گرنے کا خطرہ نہیں؟" یَن ہول نے کہا۔

"خطرے کی کیا بات ہے؟ روز ہی گرتے ہیں۔"

"آخر دوسرا ڈھکن کیوں نہیں لگایا جاتا؟" یَن ہول نے جھلّا کر کہا۔

"آخر کتنی بار لگایا جائے؟ اور وہ 'ہول' بھی کیا جو کھُلا نہ ہو۔"

میں لاجواب ہو کر آگے بڑھ گیا اور ایک جھیل کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ جھیل نے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ سے انٹرویو نہیں لیجیے گا؟" میں نے کہا۔ "میں تو گڑھوں سے انٹرویو کے لیے نکلا ہوں۔ مگر تم تو جھیل ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جھیل تو مجھے بارش اور سیلاب نے بنا دیا۔ ورنہ میں تو محض ایک ناچیز گڑھا ہوں۔" میں نے حیرت سے چلّا کر کہا۔

"اگر تم گڑھے ہو تو پھر بہت ہی بڑے ہو۔ میں نے زندگی میں اتنا بڑا گڑھا نہیں دیکھا۔ بڑے پُرانے معلوم ہوتے ہو؟" گڑھے نے کہا بھائی جان میں مہابھارت سے بھی پُرانا ہوں۔ پھر اس نے کہا یہ بھی نوٹ کر لیجیے۔ مجھ ہی میں مہابھارت لڑی گئی تھی۔ میں نے رتھوں کے دوڑنے اور تیروں کے سنسنانے کی آوازیں سُنیں۔ کورو اور پانڈو ایک دوسرے پر فتح پانے کے لیے کوشاں تھے۔ میں نے ویر ارجن کو تیر نشانے پر چھوڑتے دیکھا۔" اچانک گڑھے کے ٹوکنے سے تصورات کی پرچھائیاں اوجھل ہو گئیں۔ گڑھا کہہ رہا تھا۔ "تم ایک مہابھارت کو سُن کر چکر میں پڑ گئے۔ یہاں روزانہ کسی نہ کسی مہابھارت سے سابقہ رہتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

یہ تو سب ٹھیک ہے مگر تم کو پاٹا کیوں نہیں جاتا؟" اس نے کہا۔ مجھ کو بھلا کون

پاٹ سکتا ہے جس انجینیر کا یہ علاقہ ہے، وہ مجھ میں مچھلیاں پالتا ہے۔ اس لیے اس نے نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ اور اب میں سرکاری طور پر بجائے گڑھے کے جھیل ہوں۔ اب دنیا میں کوئی فائیل نہیں جس میں میرا وجود محض سڑک کے ایک گڑھے کی حیثیت سے ہو۔" میں نے کہا "مگر" یہ تو کھلی ہوئی چار سو بیس ہے۔" گڑھے نے کہا۔ "ہے تو کیا ہوا؟ آخر زمانہ بھی تو فورٹونٹی کا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھا تو میں چلوں۔" اور میں آگے بڑھ گیا۔ اور ایک گڑھے کے پاس رُک کر پوچھا۔

"آپ کی تعریف؟" اس نے کہا "خاکسار کو سڑک کا گڑھا کہتے ہیں۔"

"پیدایش کس طرح عمل میں آئی؟"

گڑھے نے کہا۔

"جس جگہ پر میں کبھی سڑک کا ایک حصہ تھا، وہ جگہ اُوپر سے سڑک تھی اور اندر سے محلے میں جانے والے بمبے کی مین لائن تھی۔ سیور لائن بچھانے والوں کی لاپروائی سے یہ لائن ٹوٹ گئی۔ پلمبر نے لائن کی مرمت کر کے سڑک کی مرمت کے پیسے میونسپلٹی میں جمع بھی کر دیے، مگر سڑک کی مرمت کسی نے نہیں کی اور اس طرح میں سڑک کے ٹکڑے کے بجائے ایک گڑھا ہو گیا۔"

میں کسی اور گڑھے سے انٹرویو کے لیے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک میرے سر پر آسمان گر پڑا۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ دوسرا آدمی تھا۔ جو مین ہول میں میرے اوپر گرا تھا۔

زہر کے سوداگر

جب میں اپنے دوست کھوٹو مل کو کسی عوامی تقریب میں ہار پھول پہنتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بے اختیار میرا دل چاہتا ہے کہ لپک کر کھوٹو کے سارے ہار نوچ کر اس کا گلا دبا دوں عجیب وغریب ستم ظریفی یہ ہے کہ کھوٹو نے عوام کی آج تک کوئی خدمت نہیں کی۔ سچ پوچھیے تو اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی بھی پوری طور پر سیوا کر سکے، مگر پھر بھی وہ سماج کا سب سے بڑا ٹھیکیدار بنا ہوا ہے۔ اس نے آج تک سماج سیوا کا ایک بھی ٹنڈر نہیں بھرا، اس کے باوجود وہ سماج کا واقعی سب سے بڑا ٹھیکیدار ہے۔ اس کی کامیابی کا ٹریڈ سیکرٹ اس کا پیسہ ہے۔ وہ خود کہتا ہے "پیسے سے بڑا خادم ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے!" ادھر شہر میں کوئی بڑی کانفرنس ہو، جلسہ ہو، اس کے منتظمین کھوٹو کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور اس کی خوشامد کرتے ہیں کہ "حضور ہماری استقبالیہ کمیٹی کی صدارت قبول فرمایئے!" اور حضور جی بخوشی قبول فرماتے ہوئے ایک لمبا چوڑا چیک کاٹ دیتے ہیں، پھر حضور کے چمچے، حضور کے لیے ایک بہت ہی دھواں دھار خطبۂ صدارت لکھ کر چھپوا دیتے ہیں۔ عین تقریب کے دوران سیٹھ کھوٹو گھسیٹا مل انجکشن والا کا گلا سردی سے متاثر ہو جانے کی وجہ سے ان کے سیکریٹری ادھار چند گرگٹ والا اس خطبے کو پڑھتے ہیں جس پر بے شمار داد اور تالیاں کھوٹو سیٹھ کے اسسٹنٹ سیکریٹری گھسیٹا جیب کٹ والا سیٹھ کی جانب سے وصول کرتے ہیں اور گوشت کے اس لمبے چوڑے لوبے کو جسے دنیا کھوٹو سیٹھ کے نام سے یاد کرتی ہے انسانی چمچے مختلف کونوں سے آ آ کر مالائیں پہناتے ہیں۔ سیٹھ کے کئی ملازم یہ ہار پھول

لاد کر اس کی موٹر تک پہنچا دیتے ہیں اور سیٹھ کھوٹو مل انجکشن والا کو زندہ باد کے نعروں کی گونج میں سفید پوشوں کا ایک بڑا مجمع موٹر بلکہ ان کی کوٹھی تک پہنچا آتا ہے۔ اس مجمع کے سب سے پیچھے میں، بنا کوئی زندہ باد کا نعرہ لگائے، اس کے بار نوچنے اور گلا دبانے کے امکانات پر غور کرتا رہ جاتا ہوں۔ آپ بھی کہیں گے کہ کیسے شریف آدمی سے ایسی بھی کیا دوستی میں دشمنی؟ تو میں عرض کروں گا کہ شرافت تو دور کی بات ہے، اگر میری طرح آپ کو بھی سیٹھ کھوٹو مل کے دھندوں کے کرتوت معلوم ہو جائیں تو آپ بھی اس کے لیے، میری ہی طرح سوچنے لگیں، اور یہ مان لیں کہ دوستی دوستی اپنی جگہ اور اصول اپنی جگہ۔

میرا دوست کھوٹو مل، جسے مجھے دوست کہتے شرم آتی ہے۔ دوائیں بنانے والی ایک بہت بڑی کمپنی کا مالک ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ شہر میں اس کی ایک بہت بڑی فیکٹری ہے، جس میں سینکڑوں آدمی کام کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس کے بہت سے چھوٹے چھوٹے انڈر گراؤنڈ کارخانے بھی ہیں، جن میں دو نمبر کی دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ اگر اس کے کسی کارخانے میں نقلی انجکشن تیار ہوتے ہیں، تو کسی خفیہ جگہ پر نقلی کیپسول بنتے ہیں، تو اس کے کسی اڈے پر جعلی ٹیبلٹ تیار ہوتی ہیں کسی کارخانے میں مصنوعی پنسلین بن رہی ہے۔ تو کسی میں دوا کے نام پر خاک پھر انتہائی حسین پیکنگ کے ساتھ نقل مطابق اصل دوائیں ملائے جارہے ہیں۔ مگر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے ہاں ٹنکچر کا ایک قطرہ بھی دواؤں میں شامل نہیں ہوگا وہ تو بس سیدھے ٹھیکوں کے ہاتھ بلیک ہو جاتا ہے، اور جس سے وہ زہریلی دارو تیار کرتے ہیں جن کے پینے والوں کا نشہ اُترنے کی نوبت نہیں آتی اور عین مے نوشی کے عالم میں وہ مے خانے کے بجائے گھر کے قبرستان پہنچ جاتے ہیں۔ جب ایسی کوئی موت ہوتی ہے، تو اکثر ٹھیکے والے دھر لیے جاتے ہیں مگر زہر کے سوداگر کھوٹو سیٹھ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ کھوٹو سیٹھ کو تو کوئی اس وقت بھی ہاتھ نہیں لگاتا جب اس کی نقلی دوائیں اصلی مریض کھانے کے بعد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ لوگ مرنے والے سے اظہارِ ہمدردی اور بے قصور ڈاکٹر پر غصہ گرمی کے ساتھ پھر یہ بھول جاتے ہیں کہ

کوئی مریض کسی کھوٹو سیٹھ کی دوا سے مرگیا ہے۔ مریض گھر میں دم توڑتا ہوتا ہے۔ کھوٹو برا سٹیج پر اپنی جے جے کار کے ساتھ ہار پھول پہنتا ہوتا ہے۔ اور میں اسٹیج کے پیچھے اس کے سارے ہار پھول نوچ کر اس کا گلا دبا کر خود امر ہو جانے کے امکانات پر غور کرتا رہ جاتا ہوں۔

اگر صرف کھوٹو سے میری دوستی ہوتی تو میں کب کا اسے پار لگا چکا ہوتا، مگر مجھے اپنے دوست شیخ دولت بخش کو بھی دریا میں ڈبو دینے کی بے حد آرزو ہے۔ اور یہ آرزو بھی اب حسرت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ دولت کے پیچھے بھی شہر بھر کے اندھے اسے سر پر بٹھانے کے لیے بے تحاشا دوڑتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دولت کا چیک کھوٹو سے بھی لمبا چوڑا ہوتا ہے۔

دولت بخش سے میری دوستی اس وقت سے ہے جب وہ ایک معمولی دودھ والا تھا اور دولتو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مگر میں پیار سے "دولتی" کہتا تھا۔ اور اسے گدھا سمجھتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے یہ گدھا بہت ترقی کر گیا۔ دودھ میں پانی ملاتے ملاتے، دولتو سے وہ دولت پھر شیخ دولت بخش ہو گیا۔ اب وہ شہر میں بہت بڑی ڈیری فارم کا مالک ہے۔ اس کے بڑے بڑے کارخانے ہیں جن میں مکھن گھی اور پنیر وغیرہ کے ڈبے تیار ہوتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ بلکہ خریدار ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ پھر سیٹھ دولت بخش ڈیری کے دودھ میں ساٹھ فیصد پانی ہوتا ہے۔ بیس فیصد دودھ کا رنگ اور ۱۵ فیصدی کیمیاوی اشیا بقیہ ۵ فیصد دودھ کا ایسنس ہوا کرتا ہے۔ یعنی دولت اتنی ترقی کر گیا ہے کہ اس کے دودھ میں اب ایک فیصد بھی دودھ نہیں ہوتا لیکن بظاہر جو کچھ ہوتا ہے، وہ اگر اصلی دودھ کے سامنے رکھ دیا جائے، تو خالص دودھ برابر شرما جائے گا۔ اسی کے واسطے شاید کہا گیا تھا کہ جھوٹے کے آگے سچا روئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں دولت کا دوست ہونے کے بعد سچا بھی رہ گیا ہوں یا نہیں۔ مگر اتنی سچائی ضرور جانتا ہوں، آپ بھی جان لیں اپنے رنگے ہاتھ گھر لا کر کرنے کے لیے دولت کے اس دودھ نما پانی سے، وہ ننھے منے بچے جنہیں

کل بڑے ہو کر ملک و قوم کا بار سنبھالنا ہے، سوکھے، پولیو اور دمے کے مریض ہو جاتے ہیں۔ سوکھا، پولیو اور دمہ ایسی بھیانک بیماریاں ہیں جن کا مریض ملک و قوم کیا، اپنا بار تک نہیں سنبھال سکتا۔ جب بھی شہر میں سوکھے پولیو دمہ کا مریض آتا ہے، تو بے اختیار میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے دوست سیٹھ دولت بخش کے گلے سے ہار نوچ کر اس کو زندہ باد کہنے والوں کے سامنے اسے مُردہ باد بنانے کے لیے اس کا سارا راز فاش کردوں۔ اس کے محل تک، شہر کے تمام غریبوں کا ایک جلوس بنا کر لے جاؤں، جن کے بچے اس کا دُودھ پیتے پیتے اس کے دُودھ کی ڈیری کے قبرستان میں دفن ہو گئے۔ بھسم ہو گئے۔ مگر مجھے پورے شہر کو لے جانا ہوگا۔ اسی بات کے لیے میں اسٹاپ تھنکنگ اینڈ اسٹارٹ ورکنگ نامی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ جب اہلِ شہر کو معلوم ہوگا کہ دولت کی دولت میں صرف پانی کا کھیل ایسا ہے، جان لیوا کھیل جن میں ان کے بچوں کی جانوں کی بازی لگ چکی ہے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجمع اس کا سب پانی نکال لے گا۔ اس کی ڈیری کا پانی نکالنے سے پہلے مجھے ایک پارٹی بنانا ہوگا۔ ورنہ اس کے سیلاب میں پورا شہر ڈوب جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں بھی ڈوب گیا تو کھوٹو دولت اور ان کے جیسے اَن گنت زہر کے سوداگروں کو ٹھکانے لگانے کی کون سوچ سکے گا اور کوئی سوچنے والا باقی بھی رہ گیا تو پھر اس کے پاس خدا جانے اسٹاپ تھنکنگ اینڈ اسٹارٹ ورکنگ نامی کتاب بھی جوشِ عمل کے لیے ہوگی، اور اگر سوچنے والے کے پاس یہ کتاب بھی ہو تو اس کے پاس ملاوٹ کے زہر کو ختم کرنے کا تریاق بھی ہوگا۔ جس کا نسخہ میرے پاس ہے اور اگر اس کے پاس بھی ہو تو اس کے پاس ایسا سخت ہاتھ بھی ہوگا جو ظالم کو ظلم سے روک سکے، جو ظلم کے چہرے پر سے نقاب اُلٹ کر ان خود غرض مکار اور قاتل ملاوٹ کرنے والوں کے مکروہ چہرے، ملاوٹ کا شکار ہونے والے معصوموں اور بے گناہوں کو دکھا سکے۔ اور ان سے نپٹ سکے؟

میں اس لیے بھی ڈوب کر نہیں مرنا چاہتا کہ مجھے سیٹھ تاملوٹ دالا کا بھی حساب بے باق کرنا ہے۔ تام لوٹ والے کے نام سے میرے جسم میں جھرجھری سی آجاتی ہے،

اس کا کاروبار، دال کا ہے مگر دو نمبر کا دھندا دال میں کیسری دال ملانے کا ہے۔ مویشیوں کے چارے والی دال کے کھانے سے پیروں پر فالج کا اثر ہو جاتا ہے۔ میں جب بھی تاملوٹ کے یہاں جانے کے لیے مزدور بستی سے گزرتا ہوں تو مجھے کتنے ہٹے کٹے نوجوان زمین پر گھسٹ گھسٹ کر بھیک مانگنے کے لیے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کتنے شریف اور عزت دار لوگ کیسری دال کھانے کے بعد کچھ کام کاج کرنے کے لائق نہیں رہ گئے۔ وہ آج میرے دولت تاملوٹ کے بنگلے کے سامنے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ اور میرا دوست انہیں بھکاریوں کی دولت سے موٹروں اور ہوائی جہازوں پر فراٹے بھرتا اڑتا نظر آتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ میں کوئی ملاوٹ کرنے والا بے ایمان سیٹھ ویٹھ نہیں عام آدمی ہوں اور عام آدمی کو اس لیے نہیں مرنا چاہیے کہ اسے ہر حال میں حالات کا مقابلہ کر کے حالات کو بہتر بنانا ہے۔ اس لیے میں ان سب زہر کے سوداگروں کا کباڑا کرنے کے لیے زندہ ہوں گا۔ اس اجالے کے لیے زندہ رہوں گا جس کی روشنی میں ملاوٹ کی کوئی تاریکی نہ ہوگی، جس کی صاف اور کھلی ہوا میں کوئی آمیزش نہ ہوگی اور میں ان سیٹھوں کے گلوں میں پڑنے والے ہاروں والے اسٹیج کے پیچھے سے، سامنے آسکوں گا۔

(آکاش وانی لکھنؤ سے)

رشوت ٹیکس

وزیرِ ٹیکس بڑے الجھے ہوئے تھے۔ انہیں بجٹ پیش کرنا تھا اور وہ بھی گھاٹے کا۔ بلا نئے ٹیکسوں کے چارہ نہ تھا۔ جس مد کو دیکھتے بھنا جاتے، یا تو اس پہ ٹیکس در ٹیکس ملتا، یا اُن کی سوشلسٹ پالیسی راستہ روک لیتی، مجبوراً سکریٹری کو مشورے کے لیے طلب کیا اور بولے ۔

"سکریٹری صاحب، ہم کو عوام کی غریبی دور کرنے کے لیے امیروں پر ٹیکس بڑھانے ہی پڑیں گے۔ ہم سے عوام کی غریبی اب پھوٹی آنکھ نہیں دیکھی جاتی۔"

سیکریٹری: مہاراج دیکھی تو مجھ سے بھی نہیں جاتی مگر دیکھ رہا ہوں۔ آج میں نے غریب عوام کی جو حالت اپنی موٹر سے دیکھی، اُس پہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وزیرِ ٹیکس: (خفا ہوتے ہوئے) ہاں ہاں! مانا کہ غریبوں کی حالت بہت خراب ہے، جسے بہتر بنانے کے لیے ہم بہت کچھ کر رہے ہیں۔ ضرور حالت خراب ہے، مگر ایسی بھی خراب نہیں! کیا دیکھ لیا آپ نے موٹر سے جو ہم کو ہوائی جہاز تک سے نظر نہ آیا؟

سیکریٹری: ۔ ایک آدمی سڑک پہ چاٹ کا پتہ چاٹ رہا تھا۔ کئی آدمی اور کتے اس کے پتہ پھینکنے کے ایک ساتھ منتظر تھے۔ چاٹ کے پتے پر جس طرح جھپٹے وہ دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ پتہ ایک فاقہ زدہ دبوچے ہوئے تھا، اُس کے منہ کے ساتھ کتوں کی لمبی لمبی زبانیں ایک ساتھ پتہ چاٹ رہی تھیں۔

وزیرِ ٹیکس: (بگڑتے ہوئے) ہوں۔ ۔ ۔ تو پچھلی وزارت نے حالت اس پر

تک بگاڑ دی، جسے ابھی تک ہم سنبھال نہیں پائے۔ بھلا کس علاقے کی یہ حالت ہے؟

سیکریٹری: سوائے ہمارے آپ کے جیسے علاقوں کے۔ ہر علاقے کی۔ یہی دُردشا ہے۔

وزیرِ ٹیکس:۔ (بڑبڑاتے ہوئے) یہ بدمعاشوں نے ملک کو فاقے کروا دیے۔

سیکریٹری: سرکار! ایک بات اور دیکھنے کی ہے۔ امیروں پہ آپ نے اب تک جو بھی ٹیکس لگائے، وہ انھوں نے کسی نہ کسی بہانے غریبوں کے سر منڈھ دیے۔

وزیرِ ٹیکس: (دانت پیستے ہوئے) بدمعاش ــــ ہمیشہ بچ کر نکل جاتے ہیں۔

سیکریٹری: منتری جی! عوام بھوکوں مر رہے ہیں، مانا کہ آپ اُن کے دُکھ دور کرنے کے اُپائے سوچتے ہیں۔ سوچنے سے بھلا کسی کا کوئی دُکھ دور ہوا ہے؟ آپ کا بدعنوان عملہ تو انہیں صرف لوٹنے کی ہی سوچتا ہے۔ دفتروں، کارخانوں اور کچہریوں میں لوگ میزوں، میزوں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ بلا رشوت کے نہ کوئی کاغذ کھسکتا ہے، نہ فائل۔ حد یہ ہے کہ بلا حق دیے جاں بلب مریض اسپتال تک میں بھرتی نہیں ہو پاتے۔ میں کہتا ہوں حالت اب یہ ہے کہ بلا رشوت دیے عوام کو، کہیں کوئی راحت نہیں مل سکتی۔

وزیرِ ٹیکس: (زور دیتے ہوئے) کیا یہ حقیقت ہے کہ بلا رشوت دیے کسی کو، کہیں کوئی راحت نہیں مل سکتی؟

سیکریٹری: (سر ہلاتے ہوئے) جی نہیں! بالکل نہیں!

وزیرِ ٹیکس: (بہت غور کرنے کے بعد اُچھل کر) سمجھ میں آگیا! ــــ کہاں بچ کے جاتے ہیں بدمعاش! ابھی لگاتا ہوں، بدعنوانی دشمن ٹیکس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سکریٹری صاحب یہ ہمارا بالکل نیا سماج وادی ٹیکس ہوگا، سمجھے؟ اب میں رشوت پہ ٹیکس لگاؤں گا۔ اس کے بعد اگر آپ کہیں رشوت کا نام بھی سن لیں تو گدی چھوڑ دوں گا۔ گدی ــــ!

سیکریٹری: (حیرانی سے) منتری جی مہاراج، چھما کیجیے گا۔ گستاخی معاف۔ آپ کا رشوت ٹیکس کچھ اپنے پلّے نہیں پڑا۔

وزیر ٹیکس: رشوت ٹیکس سے ہماری مراد، رشوت پہ ٹیکس ہے۔

سیکریٹری: (آنکھیں پھاڑ کر چلاتے ہوئے) سرکار! رشوت تو قانون کی نظر میں ناجائز ہے۔ اس کا لینا بھی جرم ہے اور دینا بھی جرم۔ آپ اسے کیسے لیں گے؟ اور لوگ کیسے دیں گے؟

وزیر ٹیکس: اس کی فکر اُن کو کرنا چاہیے جو بجائے جائز آمدنی کے رشوت پہ پَل رہے ہوں۔ (آنکھیں چمکاتے ہوئے) ہر سماجی خرابی کی طرح ہم رشوت کے خلاف بھی ایسا قانون بنا سکتے ہیں، جو رشوت لینے والوں کے چھکّے چھڑا دے۔ قانون بنانا ہمارا کام ہے۔

سیکریٹری: (حیرت سے) وہ کیسے؟

وزیر ٹیکس: (سمجھاتے ہوئے) مثلاً جب کسی ٹھیکیدار کا بل پھنستا ہے تو اُسے کیش کروانے کے لیے، اُسے قدم قدم پہ رشوت دینا پڑتی ہے۔ اسی طرح تمام ادائیگیوں میں تاخیر صرف رشوت لینے کے لیے کی جاتی ہے۔ ہم اس تاخیر کو دور کرنے اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے رشوت ٹیکس لگا دیں گے۔

سیکریٹری: رشوت ٹیکس لگا دیجیے گا؟

وزیر ٹیکس: ہاں! جس وقت میں کسی بھی بل کی ادائیگی یا کام میں ذرا بھی تاخیر ہوگی، یعنی ہاتھ کے ہاتھ اُسی وقت بل کیش کرنے یا کام میں مدد نہ دی گئی، یا عوام کا کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں کاغذ یا فائیل فوراً مکمل نہ ہوئی تو متعلقہ افسروں اور ماتحتوں کے بارے میں فرض کر لیا جائے گا کہ انھوں نے رشوت کے چکّر میں یقیناً ٹال مٹول کی ہے۔ پھر جرمانے کے طور پر رشوت ٹیکس براہِ راست اُن کی تنخواہوں سے کاٹ لیا جائے گا۔ یا فوری جرمانوں کی شکل میں اُن کے پراویڈنٹ فنڈ یا ذاتی اکاؤنٹ میں سے کاٹ لیا جائے گا۔ اس کے لیے ہر دفتر اور کارخانے میں انسدادِ رشوت کا ایک مخفیہ شعبہ قائم کیا جائے گا، جس کے جرمانے کی اپیل نہ ہو گی۔

سیکریٹری: لیکن سرکار اگر خفیہ کا شعبہ بھی رشوت میں شریک ہو گیا تو؟

وزیرِ ٹیکس: (زور دیتے ہوئے) ہم اس کی نگرانی کے لیے اس کے اوپر ایک اور خفیہ ایجنسی مسلط کر دیں گے۔

سیکریٹری: اگر خفیہ ایجنسی مل گئی تو؟

وزیرِ ٹیکس: (چلاتے ہوئے) ہم اس کی کڑی نگرانی کے لیے اس کے اوپر ایک وجیلنس ڈائرکٹریٹ بٹھا دیں گے۔

سیکریٹری: اگر وہ بھی مل گئے؟

وزیر: (گلا پھاڑ کر چلاتے ہوئے) ان بدمعاشوں کے اوپر انتہائی سخت جاسوس لگا دیں گے۔ (میز پر مُکّا مارتے ہوئے) بہت ہی بھروسے کے جاسوس۔

سیکریٹری: حضور خطا معاف! پھر آپ کی رشوت ٹیکس اسکیم تو وہی ہو جائے گی کہ ایک چڑیا آئی اور ایک گیہوں کا دانہ لے گئی ایک چڑیا آئی اور ایک گیہوں کا دانہ لے گئی پھر ایک اور چڑیا آئی اور ایک اور گیہوں کا دانہ لے گئی ۔۔۔۔۔

وزیرِ ٹیکس: (غراتے ہوئے) سکریٹری صاحب! الفاظ سے مت کھیلیے! یاد رکھیے، جب بڑے لوگ رشوت نہ لے پائیں گے تو پھر کوئی بھی رشوت نہ لے پائے گا۔ ہم اسمگلروں کی طرح بدعنوان کارکنوں کی بھی جان کو آجائیں گے ۔!"

وزیرِ ٹیکس کی رشوت اسکیم میں سچ مچ بڑے لوگوں کے بھی نہ بخشے جانے کی بات پر پانچ فیصد یقین کرتے ہی سیکریٹری کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور اس نے وزیرِ ٹیکس کے پانو چھوتے ہوئے کہا۔

"مان گیا مہاراج، مان گیا! واقعی بھگوان نے آپ کو بالکل صحیح ٹیکس باندھنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ واقعی آپ ہی بجٹ کے دیو کو قابو میں لا سکتے ہیں۔

وزیرِ ٹیکس: (مونچھوں کی جگہ پہ تاؤ دیتے ہوئے) سیکریٹری صاحب! بات یہ ہے کہ ہم بالکل صاف ستھرا ایڈمنسٹریشن چاہتے ہیں۔ ہمارا رشوت ٹیکس، کرپشن کی کمر توڑ کر رکھ دے گا اور سوشلزم لا کر رہے گا۔ آخر بے ایمانی سے بھی تو ایمانداری سے نپٹنا ضروری ہے۔

زیرو سے ہیرو

زندگی میں کامیابی کا راز کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہونے میں ہے۔ تیمور اور بائرن اگر لنگڑے نہ ہوتے، تو اتنے بڑے بادشاہ اور شاعر نہ ہوتے۔ ہمایوں زینے سے نہ گرتا تو اکبر شہنشاہ نہ ہوتا۔ دور کیوں جائیے۔ خود میں اگر دہلی میونسپل کارپوریشن کے گڑھے میں نہ گرتا تو ہرگز زیرو سے ہیرو سے نہ ہوتا۔

دہلی کی دوڑ بھاگ کی زندگی کسی کو پہچاننے کا موقع نہیں دیتی۔ مجھے بھلا کون پہچانتا جو چند دن کے لیے اس پر نازل ہوا تھا۔

ہوا یہ ہے کہ میں ہوٹل سے جنگ کے دوران نکلا تو ذہن قومی ہنگامی مسائل، اور نگاہیں گزرنے والیوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ نظر جو بھکی تو ایک گڑھے میں گرا۔ میونسپل کارپوریشن کے ستم ظریفوں نے گڑھے کو غالباً برسات کے انتظار میں راہ گیروں کی آزمائش کے لیے چھوڑ دیا تھا کہ یا تو گزرنے والے اسے پاٹ دیں، ورنہ برسات اسے نہر میں تبدیل کر کے، اس سڑک کے گندے پانی کی نکاسی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دے گی۔

جب سڑک کی نالیاں صفائی، دھلائی سے بے نیاز ہو جائیں تو اس پر سے نہر کیا، دریا تک نکالے جا سکتے ہیں۔ دہلی میں اسی قسم کی توقعات پر ایسے گڑھے بہت عام ہیں۔

جو لوگ گڑھے میں نہیں گرے تھے، وہ مجھے اسپتال لے گئے۔ میرا ایک پیر ٹوٹ چکا تھا، جس کو ڈاکٹروں نے جوڑ کر پلاسٹر چڑھا دیا۔

کئی ہفتے بعد چھٹی ملی۔ اسپتال سے ہوٹل واپس روانہ ہوا، مگر اس شان سے
کہ بیساکھی کی مدد سے ایک اسکوٹر رکشا پہ سوار ہو کر۔
ڈرائیور نے پلاسٹر کی جانب انتہائی عقیدت سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"جناب! جنگ میں؟"
جواب دیا۔
"اپنے علاقے میں ۔"
"کون سے محاذ پر؟"
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کہنا چاہتا تھا کہ ۔
"یہاں کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھانے آتا، نہ ٹانگ ٹوٹتی ۔"
مگر زبان نہ کھلی بات حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ ذاتی معاملات میں مداخلت سے اُبھرنے
والی خاموشی غالب آگئی۔ صرف اتنا کہہ سکا۔
"ذرا سی بات ۔ اتنا کرید کیوں رہے ہو؟"
وہ انتہائی عقیدت سے خاموش ہو گیا۔
اس دوران کسی اور سڑک سے کوڑے کا پہاڑ ہٹائے جانے نے، سڑک کا گڑھا،
گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب کر دیا تھا۔
وہ بڑے احترام سے سہارا دے کر مجھے ہوٹل کے کمرے تک لے گیا۔ میری
کرایہ دینے کی کوشش کا ڈرائیور نے بہت بُرا مانا۔ نوجوان سکھ ڈرائیور، ایک مہربان
نرس کی طرح میرا پیر سہلاتے ہوئے بولا۔
"آپ جیسے مہان ویروں کی عظیم قربانیوں سے آج وطن کا سر بلند ہے۔"
پلاسٹر کٹنے تک گھر واپس جانے سے معذور تھا۔ دل گھبراتا تو بیساکھی کے
سہارے نکل پڑتا۔ راہ میں چائے خانے، ہوٹل اور دکانوں والے زبردستی سہارا
دے کر اپنے یہاں لے جاتے۔ خاطر کرتے۔ بہت سے تحائف ساتھ کر دیتے، مگر
پیسے کے نام پر کان پکڑتے ۔ اصرار کرتے۔

"ملک و قوم پر آپ کا جو احسانِ عظیم ہے اُسے اُتارنے کا کچھ تو موقع دیجیے۔!
میں بھی انسان ہوں، آخر میرا بھی دل پیسے خرچ کرنے کو چاہتا ہے، مگر پیسے لینے کا نام سُن کر سب دور بھاگتے ہیں۔

پانو کم بخت تیزی سے اچھا ہوتا جا رہا تھا۔ اگر کچھ مسئلہ تھا تو صرف زخمی ہونے کی تفصیلات بتانے کا۔

اس انہونی مصیبت پر کارپوریشن کو کوستا، آخر میں ایک باعزت اور خوددار انسان ہوں جھوٹ سے مجھے نفرت ہے میدانِ جنگ کے بارے میں ہر سوال مجھے خاموش کر دیتا ہے۔ ایک اُداس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کہنا پڑتا ہے

"یہ تو ایک لمبی کہانی ہے، جس کا بھول جانا ہی اچھا ہے۔ خدا کے لیے یہ باتیں ختم کیجیے۔ آخر کس کس کو، کیا کیا، کہاں کہاں بتاؤں؟"

میرے انکار کے ساتھ ہی ہر عقیدت سے جھک جاتے۔ اُن کی نظروں میں میرا کچھ اور بلند ہو جاتا۔

تیزی سے اچھا ہو رہا تھا۔ بیساکھی کے بجائے چھڑی کے سہارے چلنے لگا تھا۔ پلاسٹر ابھی کٹا نہیں تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگ قربان ہونے لگتے۔

میری شہرت کی دھوم دہلی میونسپل کارپوریشن تک پہنچی۔ اس نے میری مرضی کے خلاف، میرے اعزاز میں تاریخی لال قلعے کے دیوانِ عام میں، ایک زبردست شہری استقبالیہ میری خدمت میں پیش کیا۔ اس تقریب میں وزیرِ اعظم، متعدد وزرا، دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر، دہلی کے چیف ایگزیکٹو کونسلر، دہلی کے میئر، غیر ملکی سفیر اور عمائدینِ شہر بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔

اُس دن پُروائی چل رہی تھی۔ درد بڑھ گیا تھا۔ چلنے میں کچھ زیادہ لنگڑا رہا تھا۔ سب نے کھڑے ہو کر پُرجوش نعرہ ہائے تحسین اور تالیوں کی گونج میں میرا شاندار خیر مقدم کیا۔ فوٹوگرافروں اور فلمی کیمرہ مینوں نے کئی گھنٹے میری تصویریں لیں۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ اسٹیج تک پہنچانے والوں میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی شامل تھے۔ قومی یک جہتی

اور قوم پرستی کے اس متاثر کن مظاہرے نے مجھے پانی پانی کر دیا۔

بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ سب سے موثر تقریر دہلی کے میونسپل کارپوریشن کے میئر کی تھی۔ کارپوریشن پر میں نے احسان کیا تھا اس کا انھوں نے بار بار اعتراف کیا اور اس حادثے کو مادرِ وطن کی عظیم ترین خدمت اور قربانی قرار دیا۔ میونسپل کارپوریشن کے اس نہر نما گڑھے کا ذکر کارپوریشن کے میئر تک نے نہیں کیا جس نے میری ٹانگ توڑ کر مجھے سورما بنا دیا تھا۔

تقریب کے آخر میں جب میں شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا تو میری حسبِ معمول خاموشی نے وہ کام کیا جو بڑی بڑی تقریریں نہ کر سکتی تھیں۔ میری خاموشی کو سب نے انکساری جانا۔ جس سے اُن کی عقیدت کچھ اور بڑھ گئی۔

آخر میں وہ ایک جلوس کی شکل میں مجھے میرے کمرے تک پہنچانے گئے۔ اخبار نویسوں اور آٹو گراف والوں کے نرغے سے بہ دقت مجھے نکال سکے۔ انھوں نے چلتے وقت کمرے کی باہری دیوار پر خوشنما جلی حروف میں لکھ دیا۔

"قوم آپ کی زبردست احسان مند ہے — !"

اسے پڑھنے والوں نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ اس نے ماضی سے بیگانہ سا کر دیا۔ بڑے بڑے اداکار، گوکار، موسیقار، رقاص، ادیب، مقرر اور مصوّر گھیرے رہتے۔ اگر میرے دہلی آنے سے پہلے میونسپل کارپوریشن سڑک کے نہر نما گڑھے کو پاٹ دیتی تو شاید ان عظیم فن کاروں سے ملاقات کا خواب تک میں تصوّر نہ لا سکتا۔

تحریرِ دیوار ہر دن نئے مسائل پیدا کرتی۔ وطن پرستی کے جذبہ سے سرشار لوگ انواع و اقسام کے تحائف اور دعائیں دے کر رُخصت ہو جاتے۔

ایک نوجوان پابندی سے مٹھائی کا ڈبّا اور سگریٹ کی ڈبی پیش کرنے آتا۔ ایک دن اس نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"آپ کہاں زخمی ہوئے تھے؟"

"نہر میں — !"

"نہر پہ تو بڑی بھیانک جنگ ہوئی تھی۔ خدا کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ کو زندہ سلامت دیکھ رہا ہوں۔"

اخلاقی جرأت پر قابو پانے کی اندرونی کشمکش نے زندگی کو ایک ایسے حادثے کی برکتوں سے معمور کر رکھا ہے، جس کے بے شمار فوائد ہیں، جبکہ نقصان کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے میں نے اگلے سال تک پلاسٹر نہ کٹوانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر ہمیشہ کے لیے ایسا نہ کر سکا تو مدت میں توسیع تو کرتا ہی رہ سکتا ہوں۔ یا کم از کم اتنی مدت ۔۔۔ جب تک لوگ جنگ اور اس کے سورماؤں کو یاد رکھ سکیں ۔۔۔ اور میں اسی طرح ہیرو کی حیثیت سے باعزت زندگی گزار سکوں۔ میونسپل کارپوریشن کے گڑھے سے حادثے کی مہربانی کے بعد اب دہلی سے واپس جانے کی آخر ضرورت بھی کیا ہے؟

وزیرِ قحط

قحط اس لیے پڑ گیا تھا کہ کئی سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ ایک آدھ چھینٹا پڑا بھی، تو وزیروں کے وعدوں کی طرح۔ وعدوں اور چھینٹوں پر کون کب جیا ہے؟

قحط زدوں کا شور جب انتہا پسندوں پر سختی کے بہانے بھی نہ دب سکا، تو حکام نے تحصیل کی طرف دیکھا، تحصیل نے ضلع کو دیکھا، ضلع نے کمشنری کو دیکھا، کمشنری نے ریاست کی جانب دیکھا، ریاست نے مرکز کو دیکھا، مرکز نے یو۔این۔او کو دیکھا، دیکھا دیکھی جاری رہی، عوام ایک ایک بوند پانی اور ایک ایک دانہ اناج کے لیے سسکتے رہے۔ حکومتوں میں آنکھ مچولی جاری رہی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ کام کو ہم کھلواڑ بتا رہتے ہیں، مگر کھیل تک میں ہار جاتے ہیں۔

عوام کے شور سے ہونے والی بدنامی کے خوف سے، سچ مچ ریاستی حکومت نے مرکزی حکومت کی کنڈی کھٹکھٹانا شروع کر دی۔ حکومتیں چاہیں تو کیا نہیں کر سکتیں مرکزی محکموں کے کلرکوں، افسروں، ان کی الماریوں، میزوں اور درازوں کا طواف کرتی فائل، ریاستی حکومت کی دفتری بھول بھلیاں میں واپس آ گئی۔ اتنی زیادہ دیر ہو چکی تھی کہ مزید پینڈنگ ممکن نہ تھی۔ ٹال مٹول کی چربی اتنی زیادہ فائل پر چڑھ چکی تھی، کہ اس پر مزید تہہ نہ جمائی جا سکتی تھی۔ مجبوراً قحط زدہ علاقے کو متاثرہ قرار دینے کا اعلان کابینہ کے ایک ہنگامی جلسے میں وزیرِ قحط نے کر دیا۔ اخبار اور ریڈیو، امدادی کام شروع کرنے کی سرکاری فیاضی سے گونجنے لگے۔

متاثرہ علاقوں میں۔ امدادی کام پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ اس سے غیر متاثرہ لوگوں کا زیادہ بھلا ہوتا ہے۔

امدادی کام شروع کرنے کی خوش خبری سے متاثرہ عوام میں زندگی کی لہر دوڑ

گئی کہ اب محنت مشقت کر کے تھوڑا بہت پیٹ بھرنے کا موقع مل جائے گا۔ مکھیا، لیکھپال، گرام سیوک اور سرپنچ سے پٹواری تک، سب اُن سے رجسٹر پہ اگر ۶ روپیہ یومیہ کی مزدوری پہ انگوٹھا لگوائیں گے، تو ڈیڑھ دو روپیہ تو دے ہی مریں گے۔ کسان، مزدور، نہ کبھی انگوٹھا لگوانے سے جھکتے ہیں نہ گھبراتے ہیں۔ ایک دن کی مزدوری چار دن کے کام کے بعد بھی ملنے کی توقع پر ہمارا آج جوان جے کسان، بلا عذر سو سو ناموں پہ انگوٹھا لگا سکتا ہے۔ رہا معاملہ پیٹ بھرنے کا، تو جب بھگوان تک اس پر تیار نہیں، تو مکھیا اور پٹواری کا غریب کہاں سے بھر سکتے ہیں؟ اُنھیں اپنی توند بھرنے سے فرصت ملے تو اُن کا پیٹ بھرنے کی سوچیں۔ مگر سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟ پیٹ بھرنے کو کب کوئی بھوکا نظر آتا ہے؟ وہ پیٹ تو بھرتے ہیں، مگر فائلوں کے، رجسٹروں کے اور اپنے۔ جو مزدوری ہی نہیں بلکہ پورے منصوبے اور پروجیکٹ تک بلا ڈکار لیے ہضم کر جاتے ہیں۔ پٹواری تو چھوٹا آدمی ہے، بڑے بڑے انجینئر نہروں، تالابوں اور کنوؤں تک کی کھدائی، کاغذ پہ کر لیتے ہیں، زمین کھیتی کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

ریاستی وزیر قحط نے سیڑھی کی مدد سے قحط کی فائل دیکھنے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ امدادی کام شروع ہونے تک سرکار کا لنگر چلے گا۔

انھوں نے اپنے سیکریٹری سے پوچھا:

"سکریٹری صاحب! لنگر کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

سکریٹری: منتری جی! آپ کو لنگر کا اُدگھاٹن کرنا ہوگا۔

اُدگھاٹن کا نام سُن کر وزیر قحط اتنے خوش ہوئے کہ جلدی میں کہہ گئے:

"ہاں ہاں! ہمیں قحط کا اُدگھاٹن کرنا ہوگا۔

سکریٹری: معاف کیجیے گا آپ کو قحط کا نہیں، لنگر کا اُدگھاٹن کرنا ہوگا!

وزیر قحط: وہ تو کرنا ہوگا، مگر جنتا بڑی مورکھ ہے۔ جہاں اسے کھانے کو نہیں ملتا، وہاں سے اس جگہ کیوں نہیں چلی جاتی جہاں کھانے کو ملے۔ یا کم از کم کھانے کی عادتیں ہی بدل دے۔

سکریٹری: اوہ ــــ آئی ڈیا! وزیر صاحب آپ کی تقریر تو بالکل تیار ہے
بس آپ کو صرف جا کر اُدگھاٹن کر دینا ہے۔

وزیر قحط نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ قحط کا ذمّہ دار کون ہے"

سکریٹری: بھگوان۔

وزیر قحط: (بگڑتے ہوئے) پھر مجھے کیوں گھیرا جا رہا ہے۔ قحط کی فائل بھگوان کے پاس لے جاؤ۔ اُنھی سے لنگر کا ادگھاٹن کراؤ۔

بھگوان کے پاس جانے کا حکم سُن کر سکریٹری کو پسینہ آگیا۔ اسے اپنی نئی میم یاد آگئی، جس کی خاطر اس نے بیوی بچّوں کو چھوڑ دیا تھا۔ میم کو چھوڑ کر بھگوان کے پاس جانے کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا:

"منتری جی: میرے بھگوان کے پاس جانے سے پہلے، آپ کا جنتا کے پاس جانا بہت ضروری ہے۔

جنتا کا نام سُن کر وزیر قحط کے چہرے پر چمک آئی۔ انھوں نے پوچھا "جنتا اس وقت کیا کر رہی ہے؟"

"یہ سُن کر سکریٹری نے سوالیہ نظروں سے انڈر سکریٹری کی طرف دیکھا۔ انڈر سکریٹری نے اسسٹنٹ سکریٹری کی جانب دیکھا۔ اسسٹنٹ سکریٹری نے ڈپٹی سکریٹری کو دیکھا۔ ڈپٹی سکریٹری، کمشنر کو دیکھنے لگا۔ کمشنر نے ڈی ایم کو گھور کر دیکھا۔

ڈی ایم کے سامنے اب دیکھنے کے لیے کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مجبوراً اس نے جنتا کی سی آئی ڈی کی رپورٹ دیکھی اور بولا۔

"منسٹر صاحب! جنتا اس وقت ننگی ہو کر کھیتوں میں ہل چلا رہی ہے۔"

اُن کے راج میں جنتا کے کھیتوں میں برہنہ ہو کر ہل چلانے کی خوشخبری سن کر، وزیر قحط کی دونوں باچھیں کنوئیں کے ڈول کی طرح کھل گئیں۔ انھوں نے وزارتی آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا:

"ننگی جنتا. . . . . کہاں ؟ کدھر. . . . ہل چلا رہی ہے؟"

ڈی ایم نے جواب دیا:

"سرکار! کھیتوں میں عورتیں اس لیے برہنہ ہو کر ہل چلا رہی ہیں تاکہ اِندر دیوتا خوش ہو کر پانی برسا دیں۔"

انھوں نے ڈی ایم کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"جب تک میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں یقین نہیں کر سکتا۔"

اشارہ پاتے ہی ڈی ایم کے ساتھ وزیر قحط، اپنے سکریٹریٹ کو ہکا بکا چھوڑ، موٹر پہ بیٹھ، کھیتوں کی جانب چل دیے۔

کھیتوں میں انھوں نے دیکھا کہ بہت سی برہنہ عورتوں کی آنکھیں آسمان پہ لگی ہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ کھیتوں کے کنارے اُن کے مرد، بیٹھ کیے رو رہے تھے۔ عورتیں پراتھنا کر رہی تھیں:

"ہے اندر دیوتا! ہماری حالت پہ ترس کھاؤ! ساون بھادوں کی جھڑی لگاؤ! دیوتا ہو کر وزیروں کی طرح نہ ترساؤ!"

کسان منھ پھیرے تھے، ڈی ایم منھ پھیرے تھے۔ عورتیں بھگوان کو دیکھ رہی تھیں۔ وزیر قحط ننگی عورتیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں خزاں میں شباب کی بہاریں ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مسلسل دیکھے چلے جا رہے تھے۔ وزیر کا کام ہی رعایا کو دیکھنا ہوتا ہے ــــــ

ڈی ایم نے اُنھیں بار بار یاد دلایا کہ آپ کو لنگر کا اُدگھاٹن بھی کرنا ہے۔ مگر وزیر قحط نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا۔

"ذرا بھی ٹھہرو! ابھی تک مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا ہے۔ ذرا یقین کر لوں تو چلوں ــــ"

قحط زدوں کی اچانک موٹر پر نظر پڑی، جو ان کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ سب بڑھ کر ان کی موٹر کے گرد جمع ہونے لگے۔

ڈی ایم نے معاملے کو چھپانے کے لیے، جلدی سے کھچڑی منگوا کر وزیر قحط سے

لنگر کا افتتاح کروایا۔

لنگر اُدگھاٹن کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں نے وزیر قحط کو گھیر لیا۔ اُدگھاٹن کرتے ہوئے وزیر قحط کی باچھیں کھِل گئیں۔ وہ ہنسنے لگے۔ بھوکوں کے نرغے میں ـــــ اب یہ وہ خود ہی سمجھ سکتے تھے کہ وہ بھوکوں پہ ہنس رہے ہیں یا بھوک پر، عورتوں کے برہنہ ہونے پر یا اُنھیں ننگا دیکھ لینے پر؟ وہ دیر تک کھانا بانٹنے کے پوز کھنچواتے رہے۔

رات کو ایک بہت موٹی آسامی نے اُن کے اعزاز میں ضیافت کی۔ آسامی موٹی بھی تھی، دھندے کی بھی کالی تھی، مگر کہیں دور سے اُن کی رشتے دار بھی تھی۔

دعوت کے بعد میزبان نے وزیر قحط پہ سے قربان ہوتے ہوئے پوچھا۔
"چاچا آپ نے امدادی کام شروع کروانے کا اعلان کیا ہے۔ کچھ سپلائی وپلائی کا ٹھیکہ ویکہ۔ سیوا کا موقع ملے گا؟"

وزیر قحط نے مسکراتے ہوئے کہا "ضرور ملے گا۔ مگر جب تک میں شغل وغسل کروں، تم ذرا وہ کھیتوں والی ختا بھجوا دو اور آرام کرو۔"

پھر جب ہم نے سنا کہ کچھ دن بعد وزیر قحط، ریاستی کابینہ سے اس طرح بہت سے الزامات کے بعد غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔

حالات قابو میں ہیں

اس قسم کی خبریں آئے دن اخباروں میں آپ بھی پڑھتے ہوں گے جن میں ملک کے کسی نہ کسی حصے میں آرگنائزر" "فلم انڈیا" اور پان جنیہ جیسے قوم پرست" اخباروں کے پڑھنے والوں کے حسب معمول جوش میں آجانے کی وجہ سے کسی مار دھاڑ والی فلم کے انداز پر فرقہ وارانہ فساد، لسانی دنگے یا علاقائی جوتم پیزار کی نوبت آجاتی ہے۔

مذہب کے نام پر ہونے والے ان غیر مذہبی اور خالص سیاسی یک طرفہ فسادات میں یہ نئی اسٹائل شقی قوم پرست، عورتوں کو اس طرح بے عزت اور اغوا، بچوں کو یتیم اور اسیر، جوانوں کو ختم اور بوڑھوں کو زندہ درگور کرتے، ان کے مکانوں اور دکانوں کو لوٹنے کے بعد، مکان اور دکان کے ساتھ انھیں بھی زندہ جلا دیتے۔ اور یہ سب کچھ اس معصومیت کے ساتھ کرتے ہیں کہ بے چارے جے پرکاش نارائن جیسے سرودیے تک کو، مظلوم میں ظالم کی جھلک نظر آنے لگتی ہے

نارائن۔۔۔ نارائن۔۔۔!

اخباروں میں ان واقعات کو نہایت دبا کر، روک تھام اور نظر انداز کر کے اس طور پر دیا جاتا ہے کہ ہولناک سے ہولناک فساد، ایک معمولی فوجداری، بلکہ دھول دھپا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک اخبار، جو سیکولرازم" (مذہبی رواداری نہ کہ لامذہبیت) کا علمبردار فرض کیا جاتا ہے، اس کے اس صفحہ پر جہاں کھیل کود کی خبریں اور دوسری تفریحات فراہم کی جاتی ہیں، انھیں کے ساتھ احمد آباد کے ہولناک

فسادات کا تازہ ترین اسکور بھی شائع ہوا تھا خیر یہ تو کوئی بات نہیں، ہماری جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری کار ورنہ ہمیں تو وہ ترقی پسند اخبار بھی یاد ہے جس میں فساد کی خبریں "بازار بھاؤ" کے ساتھ چھپتی تھیں۔ خیر یہ تو سمجھ لیجیے کہ اخبار ہے اور غنیمت ہے کہ فساد و ساد کی خبریں چھاپ بھی دیتا ہے ورنہ عام طور پر اخباروں میں فسادات کی تفصیلات اس طرح چھپتی ہیں کہ اوپر سے بالکل معمولی واقعہ معلوم ہوتی ہیں، بلکہ کوئی خبر ہی نہیں معلوم ہوتی اور اندر سے وہی سنگین سے سنگین تر۔ اس لیے خاصے تجربے کے بعد، مجبوراً میں اب کسی اقلیتی خبر کو بجائے شروع کے آخر سے پڑھنا شروع کرنے کا قائل ہوں یعنی جہاں سے خبر ختم ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ یہاں سے شروع ہو رہی ہے ہر خبر آنسو گیس، لاٹھی چارج، فائرنگ، دفعہ ۱۴۴، کرفیو اور فوج کی طلبی کی مختصر ترین تفصیلات فراہم کرنے کے بعد یہ خوشخبری سنا جاتی ہے۔

"حالات قابو میں ہیں"

اور ہم پھر ایک بار دھوکا کھا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کم از کم اس بار سیاں کوتوال نہیں بھئے۔ مگر اگلے دن پھر وہی خبر مزید خون خوار طریقے پر نمودار ہوتی ہے اور آخر میں پھر وہی ٹیپ کا بند، کشت و خون کی تفصیلات کے بعد ہوتا ہے۔

"حالات قابو میں ہیں"

حالانکہ یہ تو ہمارا دل ہی جانتا ہے کہ ہماری جیسی پتلی گردن والے کے علاوہ کوئی بھی قابو میں نہیں ہے خیر قابو میں تو بڑے بڑے آجائیں، مگر اس کے لیے صرف ایک شرط ہوا کرتی ہے اور وہ یہ کہ بندہ پرور آپ قابو میں لانے کی زحمت تو گوارا فرمائیں۔

اسی وجہ سے جو جتنا قابو میں ہے، اس کے اتنا زیادہ بے قابو ہونے کی خبریں برابر اخباروں میں آتی رہتی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ خوش خبری بھی ہوتی ہے "حالات قابو میں ہیں" یعنی بریڈ لیے قابو میں ہیں، لڑکے قابو میں ہیں، ماسٹر قابو میں ہیں۔ لیڈر قابو میں ہیں، پارٹیاں قابو میں ہیں، بدعنوان عملے قابو میں ہیں، غذائی آمیزش والے قابو میں ہیں فرقہ پرست قابو میں ہیں، پیاری پولیس قابو میں ہے بلیکیے قابو میں ہیں اور غرض سبھی قابو میں ہیں۔

تو پھر آخر بے قابو کون ہے؟ اور مسئلہ کیا ہے جس کا اتنا شور رہتا ہے؟ ذمّے داران جن کے بارے میں آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ وہ فساد روکنے کے بہانے فساد کراتے ہیں، یا فساد کرانے کے بہانے فساد روکتے ہیں۔ اور ایسے بھی ذمّے دار پائے جاتے ہیں جو ذمّے داری کو پوری طرح ایمان داری سے سنبھالنے کے لیے بالکل ناوابستہ، یعنی غیر جانب دار ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ناوابستہ ذمّے دار نے شطرنج کا قومی ٹورنامنٹ اس لیے جیت لیا تھا کہ فساد کے دوران ان کے کھیل کی مشق بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ہر پڑھنے اور سننے والے کی طرح، مجھے بھی کسی خبر کو پڑھنے کے بعد، اس کو سمجھنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جو میں نے اس قسم کی ناشدنی خبروں کو سمجھنے کی کوشش کی، تو میرے چھکّے چھوٹ گئے۔ کیونکہ جس خبر کا بھی، خبروں کی آزادی کے اس دور میں پیچھا کیا، تو وہ اصل سے خاصی لمبی چوڑی نکلی۔ اس پر مجھے اپنے زنٹیپے دوست خاں صاحب یاد آگئے جو ہر چیز کو اتنا زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے کہ مجھے اصلیت تک پہنچنے کے لیے ان کی ہر بات کو کم از کم سَو سے تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ مگر جب انھوں نے ایک دن بتایا کہ شہر میں ہیضے کی وبا پھیل گئی ہے۔ اور بہتر ہے کہ احتیاطاً میں کچھ دن کے لیے کسی اور شہر چلا جاؤں، تو میں نے "احتیاطاً" معاملہ کی چھان بین کی۔ پتا چلا کہ انھیں رات کو کھانے کے بعد فوراً ہی سو جانے کی وجہ سے، صرف ایک عدد کھٹی ڈکار آگئی تھی۔

اس کے بعد میں نے احتیاطاً ان کی باتوں کو ہزار سے تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ مگر آخر میں محض تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر دل ہی دل میں ان کی ہر بات کو کئی لاکھ سے تقسیم کر دیتا تھا۔

ان خبروں پر بے اختیار جب ہمیں اپنے دوست یاد آنے لگے تو ہم نے اخباروں کی خبروں کی اصلیت جاننے کے لیے اُنھیں ضرب دینا شروع کر دیا۔ مگر پریشانی یہ ہے کہ ہمیں زیادہ پہاڑے نہیں یاد ہیں، جب کہ ضرب کی رفتار بھی ہمارے دوست کی تقسیم کی رفتار کو مات پر مات دیتی چلی جا رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب اپنے ان معصوم دوست اور نادان دوستوں کی باتوں اور خبروں کو سمجھنے کے لیے باقاعدہ

ریاضی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا پڑے گی۔

حالات کس حد تک قابو میں ہیں، اس کا سمجھنا اب ہمارے لیے بہت آسان ہو گیا ہے کیونکہ حالات کی جدید لغت میں قابو کے معنی بالکل بے قابو ہیں اور مجمع منتشر کرنے کے معنی "مجمع لگانا" اور مجمع کا پتھراؤ کرنا کے معنی لوٹ مار، آتش زنی۔ آنسو گیس استعمال کرنے کے معنی فائرنگ، لاٹھی چارج کے معنی کرفیو آرڈر اور کرفیو کے معنی فوج کی طلبی۔ پی اے سی بلانے کے معنی اس علاقے کو فوج کے سپرد کرنا ہے۔ اور جہاں فوج کا لفظ استعمال ہوا۔ ہم سمجھ جائیں گے کہ فوج پہنچنے سے پہلے ہی وہ علاقہ سپردِ خاک کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد بھی اگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ "حالات قابو میں ہیں" تو آخر یہ تسلیم کر لینے میں کیا "نداق" (مضائقہ) ہے؟ کہ آخر کون سے حالات قابو میں ہیں۔ معاشی؟ سیاسی؟ اقتصادی؟ سماجی؟ تہذیبی؟ مذہبی؟ ثقافتی؟ اقلیتی؟ تنظیمی؟ اخلاقی ـــ؟ پھر آخر وہ کون سے پرائیویٹ حالات باقی رہ جاتے ہیں جن کے قابو میں رہنے کی توقع کی جائے۔ دستور، فائل اور اخبار میں اگر حالات قابو میں ہیں تو پھر ہمیں قومی یکجہتی کی خاطر یہ مان لینے میں آخر کیا تکلف ہے کہ "حالات قابو میں ہیں۔

جب سرکاری طور پر حالات قابو میں ہیں تو پھر میری سرکار کے ماننے نہ ماننے سے حاصل؟ اس لیے میرے پیارے پڑھنے والو اب تم ہی بتاؤ کہ کیا؟

"حالات قابو میں ہیں"

جوتا کانفرنس

جیسے ہی میں نے ایک عجیب قسم کے جوتے کو اُٹھایا وہ بولا ـــــ

"ارے صاحب! یہ آپ کہاں سے ٹپک پڑے، دیکھ نہیں رہے ہیں کہ میں اس وقت تقریر کر رہا ہوں۔ رکھیے مجھے رکھیے، میں تاریخی جوتا کانفرنس کو خطاب کر رہا ہوں!"

میں نے گھبرا کر جوتا زمین پر رکھ دیا۔ اب جو نظر دوڑائی تو ہر طرف جوتے ہی جوتے نظر آئے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اتنے جوتے نہیں دیکھے تھے۔ جوتا کہہ رہا تھا۔

"بھائیو! میں پتھر کے زمانے کا ہوں۔ میرا وطن عزیز چین ہے۔ مجھے فخر ہے کہ جوتا سب سے پہلے چین ہی میں ایجاد ہوا تھا۔ پھر دنیا بھر میں چل گیا۔ اور اب بھی چل رہا ہے۔ میں چین کا جوتا ہوں۔ میں کس طرح ماں کے پیٹ سے آدمی کے پیر تک پہنچا، یہ بہت ہی دلچسپ کہانی ہے۔" جوتے نے کہا۔ "میرے مالک کو سب سے پہلے گرمیوں میں ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے جب تکلیف ہوئی، تو اس نے سوچا کہ ساری دنیا کو اگر چمڑے کے ٹکڑے چپکا چپکا کر پاٹ دے، پھر کسی کے پاؤں دنیا میں دھوپ کی گرمی سے نہ جلیں گے، جب اس کا یہ پلان، اس کی کفایت شعار بیوی نے سُنا تو اس نے کہا ـــ "کون سی تمھیں دنیا بھر کی لیڈری کرنا ہے، ساری زمین باٹنے کے بجائے اپنے پیروں میں اگر چمڑے کے دو ٹکڑے تم باندھ لو، تو تمھارے پیر گرم زمین پر نہ جلیں گے"۔ یہ بات میرے مالک کی سمجھ میں آگئی اور وہ چمڑا ڈھونڈنے لگا۔ تجربے کے طور پر اس کی بیوی نے اس کے پیروں کے نیچے گھاس باندھ دی۔

جب وہ زمین پر چلا، تو اس کی بیوی نے مارے خوشی کے چلا کر کہا۔ "شو۔۔۔ شو۔!
اور اس طرح "شو" یعنی پہلا گھاس کا جوتا، دنیا میں وجود میں آگیا۔"

گھاس کا جوتا جیسے خاموش ہوا، ایک بہت ہی چھوٹا سا جوتا منہ پھاڑ چلایا۔
"اور میں بھی چین ہی کی رہنے والی ہوں، مجھے وہاں کی عورتیں اس لیے پہنتی تھیں کہ ان کے پاؤں بڑے نہ ہو جائیں اور زندگی کی دوڑ میں وہ مردوں کو نہ پچھاڑ دیں۔ اس لیے مجھے لوہے کا بنا دیا جاتا تھا۔ بس فولادی جوتی ہوں"

گھاس اور لوہے کے جوتے کو دیکھنے کے لیے کانفرنس کے بہت سے جوتے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ایک لمبا سفری جوتا کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"بھائیو میں مارکو پولو کا جوتا ہوں۔ میں نے اپنے زمانے کی ساری دنیا کی سیر کی تھی مغرب سے مشرق تک ملکوں ملکوں گھوما، اٹلی سے روس تک، تاتار سے چین تک اور لنکا سے ہندوستان تک نہ جانے کہاں کہاں یہ جوتا چلا۔ دیکھیے نا میں کتنا پرانا ہوں!"

ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک بہت ہی زبردست جوتا کھڑا ہو گیا اور گرجدار آواز میں چلایا "خان! چنگیز خاں کا جوتا ہے۔ یہ وہ جوتا ہے جو بڑے بڑے بادشاہوں کے سر پر بھی چل چکا ہے۔" میں نے زمین ہلتی ہوئی محسوس کی چنگیز خاں کی فوج اسے روندتی ہوئی گزر رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں، انسانی چیخیں، قتل و خون کی تاریخ کی ایک جھلک نگاہوں کو چکا چوند کر گئی۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔

"بہنو"! میں سقراط کی بیوی کی سلیپر ہوں۔ یہ وہی جوتی ہے۔ جو دنیا کے سب سے بڑے فلسفی کے سر پر چلتی تھی۔ اگر یہ جوتی نہ ہوتی تو شاید آج سقراط کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔ سچ ہے بہنو! بڑے سے بڑے فلسفی کے پیچھے کوئی نہ کوئی جوتی ہوتی ہے۔ کسی نے کیا سچ کہا ہے۔ "جوتا آدمی کو فلسفی بنا دیتا ہے۔" اس پر کچھ جوتے ہنس دیئے۔ اتنے میں ایک ننھی منی سے کلکتیہ ٹائپ کی سلیپر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"بہنو! یاد رکھیو! جوتا انسان کو صرف فلسفی ہی نہیں، بلکہ عظیم شاعر تک بنا سکتا ہے۔"
ایک کونے سے آواز آئی — "آپ کی تعریف؟"
جوتی نے کہا۔ "میں شیخ سعدی کی بیوی کی جوتی ہوں۔" ابھی جوتی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک جوتا اکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور بولا۔
"میں فرعون کا جوتا ہوں۔ بھائیو! گمراہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہ جوتا ہے جو عورتوں پر بھی چلا ہے۔" — اس پر کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ "الفاظ واپس لیجیے۔ ہم جوتیوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ فرعون تو خود ایک سے ایک زن مرید تھے۔" — قریب تھا کہ کانفرنس میں جوتا چل جائے کہ ایک نہایت ہی فیشن ایبل جوتی کھڑی ہو گئی اور بولی۔
"میں ملکہ وکٹوریہ کی جوتی ہوں۔ ان کی حکومت میں میں نے کبھی سورج نہیں غروب ہونے دیا۔ دنیا کے مردوں کی اکثریت اسی جوتی کے تابع تھی۔" — اس پر جوتوں نے سخت اعتراض کیا اور یہ تجویز پیش کی۔ کہ مرد اور عورت کا قصہ ختم کر کے، جوتے موجودہ زمانے کے جوتے کے رُخ پر بات کریں۔"
اتنے میں ایک نہایت ٹائٹ جوتا کھڑا ہو گیا — اور بولا۔ "بھائیو! میں بالشویک جوتا ہوں۔ جو صرف غریب کے پیر میں آتا اور امیر کے سر پر چلتا ہے۔ میرا وطن روس ہے — میں سوشلزم کی منزل کا مسافر ہوں — آپ مجھے دنیا میں کہیں بھی پا اور گن سکتے ہیں۔"
روسی جوتے جو دوسرے لوگ اشتیاق سے دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک چمرودھا کھڑا ہو گیا اور بولا — "بھائیو! آجکل ہر طرف میرا ہی بول بالا ہے —!"
بہت سی آوازیں آئیں — "جناب کی تعریف؟" اُس نے کہا —
"میں مزدور کا جوتا ہوں — میں مزدور کے پیر سے زیادہ اس کے ہاتھ میں رہتا ہوں۔ جہاں بھی کسی کارخانے میں ہڑتال ہو — میں مل مالک کے سر پر نظر آجاؤں گا۔"

اتنے میں "آرڈر آرڈر" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ایک جوتا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے فیتوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ چلّایا۔

"میں مزدور کو روکے ہوئے ہوں! میں پولیس کا جوتا ہوں۔"

مزدور کے جوتے نے چلّا کر کہا۔

"آپ ہمیں نہیں روک سکتے۔"

پولیس کا جوتا چلّایا۔

"روک سکتے ہیں۔! جوتے سے روک سکتے ہیں؟"

ایک اور جوتی غرّا کر کھڑی ہو گئی۔

"اگر آپ لوگ اسی طرح لڑتے رہے تو کام کیسے چلے گا؟" کسی نے غصّے میں بھنّا کر کہا۔

"مگر آپ کون ہوتی ہیں؟"

"میں ۔ ۔ ۔ میں سب کچھ ہوتی ہوں۔ میں نہ رہوں تو انتظام کیسے چلے؟ میں سرکار کی جوتی ہوں۔ سرکار ہی کی جوتی کی چلے گی۔ جانتے نہیں۔ آجکل ہر طرف میں ہی تو چل رہی ہوں۔!"

ابھی سرکار کی جوتی روک تھام میں مصروف ہی تھی کہ پولیس کا جوتا مزدور کے جوتے پر تڑاق سے گرا۔ مزدور کا جوتا انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر آگے بڑھ گیا۔ جوتا میری ناک پر لگا۔ بھنّا کے جو منھ کے بل گرا، تو آنکھ کھل گئی۔

دراصل میں اپنے نئے جوتے کو، جس نے پانو میں کاٹ کھایا تھا، قالب پر چڑھانے کے بعد اونگھ گیا تھا۔

اُدھار کا چسکا

انسان اس دنیا میں آخرت سے قرض کے طور پر آتا ہے، اس لیے اس کے خمیر میں قرض اور گھٹی میں قرض لینا اور دینا شامل ہوتا ہے۔ اصلی انسان وہ ہوتا ہے جس کا بال بال قرض میں بندھا ہوا ہو۔

اُدھار کون نہیں لیتا اور کون ادا کرتا ہے۔ بظاہر قرض لینا آسان اور قرض لیتے رہنا مشکل کام ہے۔ جبکہ قرض لینا بجائے خود ایک فن ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی مہربان سے کچھ نہ کچھ رقم قرض کے نام پر ضرور اینٹھ سکتا ہے۔ اور ادائیگی کی نازک گھڑی دم دلاسے دے کر ٹالتا بھی رہ سکتا ہے۔

اصلی قرض دار وہ ہوتا ہے جو قرض خواہ کے تقاضے کو ٹالنے کے لیے اور اسے سر پر موت کی طرح منڈلانے سے پہلے اس سے مزید اتنا اُدھار لے لیتا ہے کہ وہ تاب نہ لا کر میدان چھوڑ کر ہی بھاگ نکلے۔

اگر قرض خواہ اتنا ہی بڑا سورما ہو کہ اس کا قرض ادا کرنے ہی کی نوبت آجائے، تو بھی اس میں قرض دار کے لیے پریشانی کی کیا بات ہے وہ کسی اور سے اُدھار لے کر اسے آخر ادا بھی تو کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ملک الموت ٹل سکتا ہے، مگر اُدھار مانگنے والے کو نہیں ٹالا جا سکتا۔ اگر آپ اسے یقین بھی دلائیں کہ اس وقت آپ کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو آپ سے قرض حاصل کرنے کے لیے فوراً آپ کو کہیں سے قرض دلانے پر تیار ہو جائے گا کیونکہ قرض دار جانتا ہے کہ آپ اسے نقد دیں یا کسی سے قرض لے کر، ہر حال میں اس کا

حساب تو یہی رہے گا کہ "لیتا مرے یا دیتا"

اگر آپ کسی سے نقد قرض لینا پسند نہ کریں تو پھر وہ آپ کو مجبور کرے گا کہ آپ اپنی کوئی قیمتی چیز گروی رکھ کر اس کو قرض دینے کے لیے رقم کسی مہاجن سے حاصل کرلیں۔

اصل قرض دار وہ ہوتا ہے جو کبھی بھول کر اس خیال سے اُدھار نہیں لیتا کہ اس کو قرض ادا بھی کرنا ہے۔

ہمارے کرم فرما ایک خاں صاحب ہیں جن کا شمار ماہرین قرض میں ہے۔ ان کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے مگر اس کے باوجود وہ ٹھاٹھ سے مونچھوں پہ تاؤ دے کر گھومتے اور چین کی نیند سوتے ہیں۔ اگر ہم کبھی انھیں سمجھانے کی بھی کوشش کریں تو وہ اُلٹا قائل کرنے لگتے ہیں کہ۔

آخر ہم کیوں اُدھار نہیں لیتے؟ "میاں! کس چکر میں پڑے ہو، یہ تک نہیں جانتے کہ اس دنیا میں آدمی اُدھار آیا ہے۔ یہ زندگی اس کی تھوڑی ہے، اسی لیے اسے حیات مستعار کہا جاتا ہے۔ کوئی جلدی بھگت جاتا ہے اور کسی کے بھگتان میں سود در سو ڈنک جاتا ہے، اسی لیے تو یہ قرض اُدھار کا آدمی مر کے بھی جنم جنم چین نہیں لینے پاتا۔ کبھی دنیا سے اُدھار دوزخ جاتا ہے اور کبھی یہاں سے بھگت کر جنت میں پہنچتا ہے۔ کبھی دونوں طرف سے مقروض، عالم برزخ میں مٹا پتا رہتا ہے۔ آخر جب پوری دنیا قرض ادھار پر ہی چل رہی ہے، حکومتیں تک اُدھار پر چل رہی ہیں، اگر ادھار کا دستور ختم ہو جائے تو سارے بینک بند ہو جائیں، تجارت کا دنیا میں وجود نہ رہے۔ لالہ جی، مہاجن مہاراج، مغلیے اور بینکر کا کاروبار ہی ٹھپ ہو جائے"

جب ہم نے کچھ کہنے کے لیے سنبھلنے کی کوشش کی تو بھانپ گئے اور پینترا بدل کر بولے۔

"میاں! ہوش کی باتیں کرو۔ اور کہیں نہ کہیں سے صرف قرض حاصل کرنے کے بارے میں سوچو یاد رکھو جو اس دنیا میں قرض نہیں دے سکتا اس کا

کوئی دوست نہیں۔ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرو کہ یا قرض دو یا قرض لو۔ بلکہ قرض پر قرض لیتے رہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اگر پبلک سے نہ ملے تو گورنمنٹ سے قرض لو۔ کیونکہ آخر حکومت بھی تو پبلک ہی کی ہے۔"

ہمارے خاں صاحب اتنے ڈھیٹ قسم کے قرض دار واقع ہوئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر قرض خواہ تک شرما جاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا کا سارا کاروبار قرض اُدھار پر چل رہا ہے۔ شادی کی آرزو میں محبت یا محبت کے چکر میں فلرٹ بھی ایک قسم کا قرض ہی ہے۔ اسی لیے شادی کو محبت کی موت یعنی قرض کی ادائیگی کہا جاتا ہے۔ جس کو کہیں ادھار نہیں ملتا، یعنی کہیں محبت کا موقع نہیں مل پاتا، وہ کسی لمبی رقم کے آسرے میں شادی رچا لیتا ہے، یعنی اپنے آپ کو کیش کر لیتا ہے۔ یہ حساب یوں سمجھ لو کہ محبت نام ہے اُدھار کا اور شادی اس کی نقد ادائیگی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آج نقد اور کل ادھار، جس ہوٹل یا دُکان پر آپ یہ تختی لگی دیکھیں سمجھ جائیے کہ یہاں نقد کی نوبت ذرا کم ہی آتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کا ہر جگہ اکاؤنٹ چلتا ہے۔ اتنی ہی نقد خریداری میں وہ ہتک محسوس کرتا ہے۔ آدمی کی بڑائی کے حساب سے اس کی ساکھ یعنی قوتِ اُدھار بھی بڑھتی جاتی ہے۔ غریب آدمی اُدھار لینے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ غریب آدمی نادہند نکل جائے تو اس کی پٹائی سے لے کر جیل جانے تک کا خطرہ رہتا ہے۔ مگر امیر آدمی ادا نہ کرے تو اس کی خدمت میں یادداشت کے طور پر بل کی نقل ارسال کر دی جاتی ہے۔ یا نوٹس جس کا تعلق بڑے آدمی سے زیادہ اس کے وکیل سے ہوتا ہے اور جو بآسانی عدالت میں ثابت کر دیتا ہے کہ میرے سے کوئی قرض لیا ہی نہیں گیا تھا۔"

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ "قرض محبت کی قینچی ہے" کیونکہ قینچی تو دراصل نقد ہے۔ آپ ہی بتائیے آپ کے ملازم مہینہ بھر کام کریں۔ اگر آپ ان کو نقد روپیہ ایڈوانس دے دیں؟ اگر مزدور کے ہاتھ میں صبح صبح آپ مزدوری رکھ دیں تو پھر دن بھر وہ آپ کا کام

کرے گا؟ اگر تنخواہ آپ ہی کو پیشگی مل جائے تو پھر آپ مہینہ بھر کام پر جانا پسند کریں گے؟ کیا دودھ والا مہینہ بھر روز دودھ لا کے دینا پسند کرے گا؟ دراصل دنیا بھر میں جینے کا سسٹم ہی ادھار پر قائم ہے جس میں اس وقت قینچی لگ جاتی ہے، جب آپ اس اُدھار کو نقد ادا کرنے لگتے ہیں۔

اس پر مجھے اپنے ایک مہربان یاد آگئے جو صرف قرض کے فن سے واقف ہونے کی وجہ سے پروفیسر ہونے کے باوجود ایک بڑے ماہر تعمیرات کے کان کاٹنے میں کامیاب ہو گئے اور ہوا میں مکان بنا لیا۔ ہوا یہ کہ انھوں نے اپنے تمام ادیب دوستوں کو خوش خبری نامے دوڑا دیے کہ میں نے ایک بُک سوسائٹی قائم کرلی ہے، جو آپ کی سب کتابیں ہاتھوں ہاتھ یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں بکوا دے گی اور جلد ہی آپ کی رقم مع منافع کے مل جائے گی۔ دوستوں نے خوشی خوشی کتابیں بھیج دیں، جنھیں بیچ بیچ کر وہ اپنا مکان بنواتے رہے اور اپنے محبت بھرے خطوط کے ذریعے دوستوں کے غصّے کے سوڈے واٹر کا اُبال اُتارتے رہے، مکان بن گیا۔ اور کوئی سمجھ تک نہ پایا کہ یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا۔ قرض کی پینے میں غالب کی فاقہ مستی تو ایک دن رنگ بھی لے آئی تھی مگر قرض کی لگانے پر اُن کے یہاں کسی دن بھی رنگ نہ آیا۔

اسی طرح ہمارے ایک بہت ہی محترم دوست ہیں۔ وہ قرض لینے میں بڑے ایکسپرٹ ہیں مگر اِدھر قرض لیا اور اُدھر ڈاک خانے میں جمع کر دیا، چونکہ کوئی اُن سے قرض وصول نہیں کر پاتا اس لیے اب ان کا کئی بینکوں میں حساب ہے۔ یہ کامریڈ اسٹائل سے قرض لیتے ہیں، یعنی جہاں انھوں نے تقاضے کا خطرہ محسوس کیا اور مزید قرض کا مطالبہ کر دیا۔ اور وہ بھی اس شدّت کے ساتھ کہ قرض خواہ تاب نہ لا سکے۔

ہمارے ایک شناسا ہیں جنھوں نے اپنی کمپنی سے قرض لینے کے لیے روتے ہوئے باس سے جا کر کہا کہ ان کی جوان لڑکی مر گئی ہے اسی کے ساتھ قرضے کی درخواست آگے بڑھاتے ہوئے پچھاڑیں کھانی شروع کر دیں۔ افسر اس لڑکی کو جانتا تھا۔ اس نے

بڑا اثر ہوا اور قرضہ مل گیا۔ شام کو جب وہ افسر سینما دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ماتحت مع اپنی مرحوم لڑکی کے سینما کی لائن میں لگا ہوا ہے، مگر ضبط کر کے نظر انداز کر گیا۔ دوسرے دن اس نے ان کی تمام قرض کی درخواستیں پڑھیں تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا یہ فرض شناس ماتحت کمپنی بہادر سے قرض حاصل کرنے کے لیے اب تک پانچ دفعہ اپنے والد کو دس دفعہ اپنے چچا اور ماموں کو متعدد بار اپنی اکلوتی والدہ کو مارنے کے بعد اب اپنی جوان لڑکی کو موت کی گرفت میں دے چکا ہے۔ کچھ ہی دن بعد اتفاق سے بہت بارش ہوئی اور سیلاب آگیا۔ یہ صاحب روتے پیٹتے قرض یا امداد کی درخواست لے کر اس کے پاس پہنچے اور بولے "مجھے روپیہ اور چھٹی فوراً دیجیے۔ سیلاب میں مکان بہہ گیا۔ جان بچانے کے لیے والد صاحب ایک درخت پر چڑھ گئے۔ کئی دن سے پیڑ پر ہیں، وہیں سے بیٹھے بیٹھے یہ خط لکھا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے باپ کا خط دکھایا تو افسر نے ڈپٹ کر پوچھا، "جب وہ پیڑ پر ہیں تو پھر یہ خط انھوں نے پوسٹ کیسے کیا؟" آدمی سمجھ دار ہیں۔ سمجھ گئے کہ اس بار جھوٹ نبھ نہ سکے گا۔ یہ کہہ کر وہاں سے فوراً کھسک گئے کہ "یہاں پر تو میں بھی قائل ہو گیا۔ دیکھیے ابھی پتا لگا کے آتا ہوں۔"

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا میں جس کو جس سے کام لینا ہوتا ہے، وہ اس کو اٹکائے رکھتا ہے۔ یعنی کچھ پیسہ دبا لیتا ہے۔

اگر دنیا سے قرض اٹھ جائے تو ایک بھی فلم نہیں بن سکتی، ایک بھی کمپنی نہیں چل سکتی، ایک بھی کارخانہ نہیں چالو رہ سکتا۔ گھر اور حکومت کا تو شاید اسی دن ہارٹ فیل ہو جائے کیوں کہ ان کے تو سارے دھندے ہی قرض پر چلتے ہیں۔

آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قرض لینے یا اس کے ادا نہ کرنے میں خوف خدا کی بھی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ اس کی ساری خدائی بھی تو آخر قرض ادھار پر ہی چل رہی ہے، جس کی ایک شکل عذاب، ثواب، جنت اور دوزخ ہے، اس لیے وہ یقیناً نمرود کی خدائی ہو گی جس میں ادھار پر پابندی ہو گی۔

ہم نے ریسرچ کی

کسی نہ کسی طرح ایم۔اے کر لینے کے بعد بھی جب کسی نے ہم کو ٹکے کا نہ پوچھا، ہمارے نام کی تختی میں "ایم اے" کا دُم چھلا بھی ہماری شخصیت میں چار چاند نہ لگا سکا تو ہم نے اس خیال سے روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر۔

بعد اشک ورانشک بدھو، جمّن، وفاتی اور گھسیٹے سے شومیٔ تقدیر کا شکوہ کرتے ہوتے، ان کی کامیابی اور کامرانی کے اسباب دریافت کیے۔

ہماری چوپال کے آنریبل ممبران نے متفقہ طور پر سمجھایا "چونکہ یہ دِتّی نہیں اور بستی ہے، اس لیے پگڑی بچانے اور پیٹ پالنے کے لیے جہاں آپ نے ایم۔اے کیا وہاں لگے ہاتھوں ایک عدد پی ایچ ڈی بھی کر ڈالیے!"

پی ایچ ڈی کے سلسلے میں مزید چھان بین اور خاصی تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ پیٹ اچھی طرح پالنے اور باقاعدہ سر چھپانے کے لیے ایک عدد پی ایچ ڈی کر ہی ڈالی جائے۔

کافی نظریں دوڑانے کے بعد ہماری نظر اپنے لنگوٹیے بندو پر پڑی جو خیر سے اب پی ایچ ڈی تھے اور ڈاکٹر بندے علی خاں بی اے آنرز، ایم اے، پی ایچ ڈی کہلاتے تھے۔ بندے نے پہلے تو پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا، مگر جناب ہم بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے ؎ آخر وہ ہماری جھٹکی میں آ گئے اور اپنے "ٹریڈ سیکریٹ" بتانے پر راضی ہو گئے اور ہمیں مشورہ دیا "عربی، فارسی یا انگریزی میں جس موضوع پر کام ہو چکا ہے اسی موضوع پر اردو میں تم بھی کام کر دو، اس کے لیے کوئی پرانی گمنام یا کمیاب

تھیسس تلاش کر لی جائے گی۔ بس تم ایک اچھا سا مترجم تلاش کر لو۔ ڈاکٹریٹ پیسے کا کھیل ہے۔ ڈاکٹر تو سمجھو تم ہو گئے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جس موضوع پر کسی نے کام کیا ہو مگر باقاعدہ ڈاکٹر بننے کے خیال سے کام کیا ہو، اس کی اس تلاش و تحقیق کو تم تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ کر ایک نئی ٹریل بنا دو، بس وہی تمھارا بالکل اوریجنل کام سمجھا جائے گا۔"

غرض بندے نے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ہم کو دن میں ڈاکٹریٹ کے تارے نظر آنے لگے۔

بدھو کو پڑھانے کے لیے یونیورسٹی جانے کی جلدی تھی، مگر چلتے چلتے سمجھا گئے "بھیا، پڑھتا لکھتا کون مسخرا ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔ آپ ایک حرف نہ پڑھیے۔ لیکن شور مچاتے رہیے کہ پڑھتے پڑھتے مرے جا رہے ہیں۔ مگر اس کے لیے تھوڑی سی اوپری ٹیپ ٹاپ ضروری ہوتی ہے۔ میاں آخر دنیا داری بھی تو کوئی چیز ہے۔"

اس کے بعد ہماری بہت کچھ سمجھ میں آگیا اور کلیدِ کامیابی ہاتھ آتے ہی یکلخت اپنا چولا بدل دیا۔

صاحب! دیکھتے دیکھتے ہماری کایا پلٹ ہو گئی۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف۔ باڑی کی نیلام شدہ کمانی دار عینک کی جگہ خالص انٹلکچول مارکہ سیاہ چشمے نے لے لی۔ آنکھیں چُرانے کے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی شیروانی کو خیر آباد کہہ کر سوٹ، بوٹ اور ایک عدد جہازی مارکہ پورٹ فولیو سے لیس ہو گئے۔ پچھلی بے فکری کی جگہ چہرے پر غور و فکر کے آثار بوریت کی حد تک طاری کر لیے۔ یاروں کے جرگوں اور دوستوں کے جھرمٹ میں ہمہ گشتی ایک دم ختم کر کے، نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے۔ اب ہماری ساری کوشش اور توجہ اپنے نگراں اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ صاحب کو شیشے میں اُتارنے پر صرف ہونے لگی۔

جیسے ہی ہمیں پی ایچ ڈی میں داخلہ ملا، ہم نے کام شروع کرنے کے بجائے کہ تحقیق کا میدان سر کرتے، یہ پتا لگانا شروع کیا کہ یونیورسٹی کی کس کس مدے

کتنی کتنی رقم کس کس شکل میں اینٹھی جا سکتی ہے۔ غرض صاحب پہنچتے ہی کافی کاغذی گھوڑے دوڑائے اور استادی کے وہ ہاتھ دکھائے کہ کبھی کتابوں کے لیے رقم لیے چلے آ رہے ہیں، تو کبھی دوسری یونیورسٹیوں اور لائبریریوں سے مواد فراہم کرنے کا بھتہ بنا رہے ہیں، تو کبھی اسکالرشپ منظور کروانے کے لیے ڈین اور وائس چانسلر صاحب کے دفتر کا گز بنے ہوئے ہر ہر موڑ پر اپنی صورت ان کو پہنچو رہے ہیں۔

اسکالرشپ ملنے کے بعد ہم ڈپارٹمنٹ اور لائبریری میں نظر آئے تو ڈاکٹر نبدے علی خان بی اے آنرز ایم اے پی ایچ ڈی کو بے ساختہ ہماری سادہ لوحی پر ترس آ گیا اور بڑے پیار سے ہمیں الگ لے کر سمجھایا:

"آخر یوں جان دینے سے کیا فائدہ، جب پیٹ کی خاطر سارا دھندہ پھیلایا ہے تو پھر جان ہلکان کرنے سے حاصل! " یونیورسٹی آنے سے نہیں روکتے، مگر بس تبدیلی آب و ہوا کی حد تک مناسب ہے۔ لائبریری بھی جاؤ بلکہ بے شک جاؤ مگر صرف احباب کو تلاش کرنے، شعبہ میں بھی آؤ مگر محض آئی ڈیاز بنانے اور اساتذہ کی مزاج پرسی کے لیے تاکہ سب سے تعلقات خوشگوار رہ سکیں۔ رہی ریسرچ تو اس کے لیے ابھی ایک عمر پڑی ہے۔ کوئی گاڑی تھوڑی چھوٹی جا رہی ہے۔ برخوردار جانتے نہیں؟ اسکالرشپ پانے کے دوران کام کرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے کا پڑھنا لکھنا نہیں بلکہ وہ سوشل لگانا اور دربارداری کام آتی ہے — میاں بس صدر شعبہ کے مکھن لگانے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہونا چاہیے ورنہ بڑی بڑی نزاکتیں پیدا ہو سکتی ہیں، بلکہ میری مانو تو یونیورسٹی آؤ مگر صرف اسکالرشپ کا چک کیش کرانے کی حد تک سہ"

اس پُرخلوص بات چیت کا انتہائی خوشگوار اثر ہم پر ہوا اور ہم نے ڈپارٹمنٹ یا لائبریری جانے کے بجائے یونیورسٹی کے ہونے والے جلسے جلوس اور کھیل تماشوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ احباب کی کثرت اور اسکالرشپ کے زور نے ہماری شخصیت بڑی پُروقار بنا دی۔ جب کبھی بھولے بھٹکے ہم ریسرچ روم پہنچتے، تو دم بھر

میں لائبریری ہمارے رونق افروز ہونے سے تفریح الاحباب کلب میں تبدیل ہو جاتی۔

یہ بات نہیں کہ اس دوران ہم تحقیق کے فرض سے یکسر غافل ہو گئے یا ہم میں بے ادبی کے آثار پیدا ہوئے۔ نہیں بلکہ ہم مصروف سے مصروف تر ہوتے چلے گئے۔ ریسرچ روم پر ہماری میز پر کتابوں کی تعداد اور گرد بڑھتی گئی۔

ہماری بغل میں نبدر یا کے بچے کی طرح دبے رہنے والے پورٹ فولیو کا پیٹ اس طرح پھولتا جا رہا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو بھی شبہ ہو جاتا کہ واقعی کسی دن اس میں سے تھیسس نہ تولّد ہو جائے۔

ریسرچ کے بہانے کھا کھیل کر جب ہم نے کئی سال گزار دیے تو ہمارے دوستوں، بزرگوں اور رشتے داروں نے اٹھتے بیٹھتے ہمارا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف سے انکوائیریز آنے لگیں۔

"کہیے جناب! ریسرچ کس منزل پر ہے؟"

"کب جمع کر رہے ہیں؟"

"ٹائپ شروع کروا دی؟"

"اس کنووکیشن میں ڈگری مل جائے گی؟"

ہرچند کہ ہم نے اب تک باقاعدہ اپنی تحقیق کی ۸۶ بھی نہ لکھی تھی، مگر ہمیشہ بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیتے:

"بس اب ختم پر ہے!"

"جمع کرنے والے ہیں۔"

"اور جو کوئی پوچھتا

"کس اسٹیج پر ہے؟"

تو کہتے

"اسٹرکچر پر ہے۔"

اور پوچھنے والا ہنس کر خاموش ہو جاتا۔

جب ہمارے نگراں صاحب پوچھتے تو ہم انھیں یہ بتا کر مطمئن کر دیتے،
"نوٹس تو مکمل کر لیے ہیں، بس اب لکھائی کا لگّا لگایا ہے۔"
وہ فرماتے ـــ
"ارے بھئی ہم بھی تو دیکھیں کہ آخر آپ کیا لکھ رہے ہیں؟"
تو ہم عرض کرتے ـــ
"جی ہاں! وہ بس اب میں دو دو، تین تین چیپٹر ایک ساتھ آپ کو دیکھنے کے لیے دینے والا ہوں۔ دو تین قسطوں میں کام مکمل ہو جائے گا!"
قسمت کی خرابی دیکھیے کہ ہمارے نگراں صاحب نے بلا ہمارا کام دیکھے، ہماری رپورٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کا ایک فوری نتیجہ تو یہ ہوا کہ واقعی ہمارے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ دوسرے ہم اسکالرشپ کی قسط نہ حاصل کر سکے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے مجبوراً ڈاکٹر بندے علی خاں کی چوکھٹ پر سجدہ کیا۔

انھوں نے نہایت اطمینان سے ہمارا نوحہ سُنا۔ اُس کے بعد پوچھا
"تمھاری تھیسس کا عنوان کیا ہے؟"
عرض کیا۔
"ڈاکٹر صاحب عنوان ہے۔ "اُردو شاعری میں تال وسُر کی اہمیت"۔"
وہ کچھ سوچتے ہوئے اندر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہم پر ہنستے ہوئے واپس آئے، اُن کے ہاتھ میں ایک نہایت بوسیدہ جلد تھی، جو رسالہ "گیت کار" کی سال بھر کی فائل تھی۔

اور بولے۔
"دیکھو یہ رسالہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانے میں نکلتا تھا۔ اس کی اب دوسری جلد کہیں نہ ملے گی۔ قطعی نایاب ہے۔ اس میں استاد اللہ رکھے کا ایک مسلسل مقالہ "تال وسُر کی شعریت میں اہمیت" چھپا تھا اب تم اسے ابواب

ں تقیم کر کے اپنی سِنا بس کے مطابق صرف نقل کرتے جاؤ اور جہاں لفظ "شعریت"
ئے وہاں شاعری لکھ دینا۔ بس پھر تم کو دنیا میں ڈاکٹر ہونے سے کوئی نہیں روک
سکتا۔"

ہم نے رسالہ کی جلد اپنے پورٹ فولیو میں رکھی اور گھر پہنچ کر کمرہ اندر سے
بند کر لیا۔ ایک مہینہ تک ہم انڈر گراؤنڈ رہے اور مہینہ بھر بعد جب ہم مع اپنی تھیسس
کے برآمد ہوئے تو ڈاکٹر بندے علی نے نہایت ایمان داری سے رسالہ "گیت کار" کی جلد
واپس دکھا دی۔ ہم نے تھیسس ٹائپ کر کے داخل کی اور یونیورسٹی نے ہمیں
کریڈٹ عطا کر کے یہ صرف گاؤن میں تصویر کھچانے کا سنہری موقع دیا بلکہ ہمارے
نام کے آگے بجائے "ایم اے" کے ایم اے پی ایچ ڈی" ہو گیا۔

بندے کی کوشش اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ صاحب کی مہربانی سے
چند ہی دن میں "ڈاکٹر" کے ساتھ ساتھ ہمارے نام کی تختی میں "پروفیسر" کا بھی اضافہ
ہو گیا ہمارے اور ڈاکٹر بندے علی خاں پھر سے لنگوٹیے بند و ہو گئے جن کے ساتھ اب ہم
ٹھاٹھ سے یونیورسٹی جاتے، اسٹاف کلب میں برج کھیلتے اور پالیٹکس لڑاتے ہیں۔

•

بھوندو میاں

بھوندو میاں جب سال بھر کی پڑھائی اور رٹائی کے بعد بھی سالانہ
میں فیل ہو گئے تو یہ خبر ان کے چچا توندو میاں تک پہنچی، جو بہت بڑے لیڈر تھے
انھوں نے بھتیجے کو اپنے یہاں بلایا اور اس کی ناکامی پر حیرت کا اظہار کر
کہا: "تمھارا جیسا ذہین اور محنتی طالب علم کیسے امتحان میں فیل ہو گیا؟" پھر
بھتیجے کے فیل ہونے کے اسباب کی چھان بین کی۔ لیڈر نے پوچھا "تم نے
ٹیچر سے ٹیوشن پڑھا تھا؟" بھوندو نے جواب دیا "جی نہیں"۔ توندو میاں
دریافت کیا "جو ٹیچر تم کو پڑھاتے تھے، ان کے گھر کے کام کاج میں ہا
تم جاتے تھے؟"

بھوندو میاں نے انکار میں سر ہلایا۔ "اسکول کی بلڈنگ فنڈ
چندہ دیا تھا ــــــ"

"نہیں ــــ!" "کبھی پرنسپل یا کسی ماسٹر کو کوئی تحفہ دیا؟" "جی
"اسکول میں کبھی کوئی اسٹرائک کرائی؟" "جی نہیں"
"کبھی کسی ٹیچر کو مارا؟" "جی نہیں"
"اسکول میں کسی پرچا تو نکالا؟"

"نہیں"

لیڈر چچا نے بھوندو میاں پر ترس کھاتے ہوئے پوچھا۔
"پھر آخر میں پوچھتا ہوں کہ سال بھر تک تم نے کیا کیا؟"

"میں نے سال بھر یہ کیا کہ پابندی سے اسکول گیا اور بہت محنت سے پڑھا

لیڈر چچا نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا "میں کہتا ہوں، پڑھائی لکھائی
دگوں۔ یہ بتاؤ کہ جب تم نے امتحان دیا تو جس ماسٹر کے پاس کاپی گئی تھی۔
کے پاس کوئی سفارش بھی پہنچائی؟"

بھوندو میاں نے جواب "جی نہیں"

"تم نے پرنسپل کو نکلوانے کے لیے کبھی کوئی ہڑتال کرائی؟" "نہیں"

لیڈر چچا نے سر پیٹتے ہوئے کہا "جب تم نے کام یاب ہونے والا کوئی بھی
ں کیا تو پھر پاس آخر کیسے ہو جاتے؟"

اس کے بعد لیڈر چچا نے بھتیجے کو امتحان میں نمایاں کام یابی کے کچھ گر
اور اسے گھر واپس بھیج دیا۔

اسکول کھلتے ہی بھوندو میاں نے اسکول کے منیجر کے دفتر کے سامنے
ہڑتال شروع کر دی۔ ان کی مانگیں یہ تھیں: پرنسپل کو نکالا جائے۔
میں فیل کرنے کا بلکہ امتحان لینے کا طریقہ ہی ختم کر دیا جائے، فیس اور
آدھی کر دی جائے۔ انٹرول میں دن کا کھانا اسکول سے ... اور
کو روزانہ جیب خرچ دیا جائے۔"

بھوندو میاں کی بھوک ہڑتال میں پرنسپل صاحب کے خلاف ٹیچروں
خاص طور سے منیجر صاحب نے اس لیے بڑی دلچسپی لی کہ ان کی پرنسپل
چلتی تھی۔

بھوندو میاں نے کالج کی سیاست کو سمجھتے ہوئے یہ شرط بھی رکھی کہ مانگوں
نے کے وعدے پر وہ منیجر صاحب کے کہنے سے بھوک ہڑتال توڑ سکتے ہیں،
صاحب نے ایک زور دار ناشتے پر بھوندو میاں کی بھوک ہڑتال ختم کرا دی۔
منیجر نے پرنسپل سے جواب طلب کر لیا کہ اتنے ذہین طالب علم کو اس نے

فیل کس طرح کر دیا۔ پرنسپل نے اپنے سر سے بلا ٹالنے کے لیے بھوندو میاں
کلاس ٹیچر سے جواب طلب کر لیا۔ اور کلاس ٹیچر نے غلطی کی ذمہ داری
دوسرے ٹیچروں پر رکھی۔ اور دوسرے ٹیچروں نے اسکول کے کلرک پر ذمہ
رکھی۔ اور کلرک نے چپراسی پر۔

اس کے بعد منیجر نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھا دی جس نے یہ فیصلہ کیا بھوندو
میاں کی کاپیاں دوبارہ جانچی جائیں اور اس چپراسی کو نکال دیا جائے جس
غلطی سے بھوندو میاں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اگر وہ رزلٹ اُن کے یہاں
لے جانے کے بجائے منیجر صاحب کے پاس لے جاتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

اس کامیابی کے بعد بھوندو میاں اسکول کے مانے ہوئے لیڈر ہو گئے
وہ نہ صرف چند ہڑتالیں کرانے کے بعد ہر سال فرسٹ آنے لگے، بلکہ پڑھائی ختم
کر کے وہ وکیل نما لیڈر ہو گئے۔ اور آج وہ نہ صرف اسمبلی کے ممبر ہیں بلکہ ان کا
ایک پیر جیل میں اور دوسرا وزارت کی کرسی پر رہتا ہے۔

بھولنا

مجھے ان لوگوں پر بڑی حیرت ہوتی ہے جنھیں پیدائش سے پتھر کے زمانے تک کے واقعات اس طرح یاد ہوتے ہیں جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہوں۔ پتھر کے زمانے کی یادگار تو اب صرف وہ پتھر دل لوگ رہ گئے ہیں جن کو محبوبہ سے فائر بریگیڈ تک بے شمار ٹیلی فون نمبر، دوستوں اور دشمنوں کے پتے زبانی یاد ہوتے ہیں۔ یہ آپ کو بتلائیں گے کہ ۵۰ سال پہلے فلاں راجا صاحب کے پوتے کے مونڈن میں کلکٹر صاحب کے کس جملے پر محفل لوٹ پوٹ ہو گئی تھی اور جس کی نقل دادا جان کے منہ چڑھے ملازم بھوندو نے کتنی مزے دار اتاری تھی۔ پھر یہ آپ کو فلمی اداکاروں، کرکٹ کے کھلاڑیوں، جرائم پیشہ حضرات اور آس پاس تک کے خاندانوں کے شجرے، تاریخ پیدائش، سال گرہ، تعداد رومانس، اسکینڈل، شادی، انتقال اور عروج و زوال کی داستانیں اس تفصیل سے سنائیں گے کہ آپ حیرت میں پڑ جائیں۔

مجھے یہ سب سن کر اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ یہاں تو یہ تک یاد نہیں رہتا کہ کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں؟ دن تاریخ پوچھنے کے بعد بھول جاتا ہوں بجلی کا بل جمع کرنا ہو تو ڈاک خانے کی لائن میں لگ جاتا ہوں۔ اگر کوئی داہنے یا بائیں طرف جانے کو کہے تو مجھے اس کا داہنا، بایاں ہاتھ پوچھنا پڑتا ہے۔

ایک ماہر نفسیات نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آخر کتنے لوگ بھلکڑ ہونے کے باوجود (چاہے وہ مرد ہوں یا عورت) بلا کپڑے پہنے گھر سے باہر نکل آتے

ہیں۔ گھر کے باہر تو ایک دن صبح صبح میں بھی دودھ ڈبل روٹی لینے نکلا، ہر شخص مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ جلا بھنا گھر میں گھسا تو گھر والی کا ہنسنا کھل گیا، لیکن میرے آپے کے اندر ہونے سے پہلے یہ بتا کر شرمندہ کر دیا کہ میں ان کا پائجامہ پہنے ہوئے ہوں۔

لیکن اس بھولنے کا کوئی مقابلہ دوا پینے کی پابندی سے نہیں کیا جا سکتا۔ دوا خرید لینا اور پرچہ ترکیب استعمال سمجھ لینا بے حد آسان ہے۔ ہر دوا کھانے یا ناشتے سے پہلے یا بعد میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے یاد آنے کے لئے ناشتے یا کھانے کا سامنے آجانا بہت کافی ہے لیکن اس کے باوجود مریض کیا، ڈاکٹر تک دوا پابندی سے استعمال نہیں کر پاتے۔

ماہرین نفسیات نے اس کی وجہ بھولنا، بتائی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ماہر نفسیات مریض سے زیادہ بھلکڑ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک میرے چچا بھی ماہر نفسیات ہیں اور ہر قسم کی دوائیوں کے عاشق۔ چچا زندگی بھر دوائیں خریدنے کے باوجود ایک بار بھی وقت پر دوا نہ پی سکے۔ میرے نزدیک ان میں اور ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں جنھیں زبردستی پٹک کر دوا پلائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے چچا کا خیال ہے کہ دوا علاج کے اس فرسودہ نظام میں، اگر انقلابی تبدیلیاں فوراً نہیں لائی گئیں تو انقلاب آجائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر ڈاکٹر ڈبل فیس وصول کرلے، ایک دوا کی دوسری اسے پلانے کی، تاکہ ڈاکٹر صبح و شام مریض کے گھر جا کر اسے زبردستی دوا پلا سکے۔ اگر مریض شورہ پشت ہو تو ڈاکٹر اس کی پولیس میں رپٹ لکھا دے تاکہ پولیس کا اڑن دستہ پہنچ کر مریض کو مار پیٹ کر دوا پلا دے۔ چچا کو یقین ہے کہ جب بھی اس سلسلے میں حکومت نے کوئی کمیشن بٹھایا، تو وہ ان کے قیمتی مشوروں سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔

جن دواؤں کی پبلسٹی زیادہ ہوتی ہے ان کا تعلق مرض سے زیادہ دودھ بھارتی اور ریڈیو سیلون کے تازہ ترین فلمی گانوں سے ہوتا ہے۔ ایسی تیر بہدف

دوائیں ہمیشہ چچا کی جیبوں میں ناجائز استعمال کی منتظر رہتی ہیں، ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ نورانی تیل" تو چچا ہمیشہ خریدتے ہیں مگر فائدہ ہم اٹھاتے ہیں۔ "امرت دھارا" وہ لاتے ہیں مگر استعمال میں آتا ہے چچی کے۔

دوا تو شاید کبھی غلطی سے، چچا بے وقت استعمال کر بھی لیتے ہوں، مگر ڈاکخانے میں خط ڈالنا آخر کسے یاد رہتا ہے؟ اس معاملہ میں اس ذمے دار آدمی تک پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جو سیدھا ڈاک خانے جا رہا ہو، یا ڈاکیہ ہو نہ اس کی قسم پر بھروسہ کرنے کی ہمت کی جا سکتی ہے۔ یہی فرمائش اگر کوئی مجھ سے کر بیٹھے تو میں سمجھوں گا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں کیونکہ جب میں کوئی بہت ضروری خط پوسٹ کرنے کے لیے احتیاطاً مٹھی میں دبا کر نکلتا ہوں تو کئی ڈاکخانے اور لیٹر بکس گزر جانے کے بعد مزید احتیاط کے لیے خط جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ پھر کوئی بے تکلف دوست چائے خانے میں لے جاتا ہے۔ گپ لڑا کر ہم رخصت ہو جاتے ہیں آخر سال بھر بعد وہ شخص عذاب کی طرح نازل ہو جاتا ہے جس کے خط کا مجھے جواب پوسٹ کرنا تھا۔ میں ڈاک خانے کی بھاگ دوڑ سے بچنے کے لیے خط اسے اس لیے دے دیتا ہوں کہ وہ آدمی ہے۔ کوئی لیٹر بکس نہیں۔ دستی خط میں یہی فائدہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ پہنچ جاتا ہے اسے پوسٹ کرنے کے لیے بھٹکنا نہیں پڑتا خط کے سلسلے میں، مجھے بھی سخت خانہ جنگیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ایک دفعہ مجھ پر خط کھو دینے کا الزام لگ گیا۔ ثبوت کے طور پر بیں نے خط جیب سے نکال کر جب اس سے دستبرداری کا اعلان کیا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں، "بھلا آپ کو میرے ماں باپ کی بیماری سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے!" اور پیر پٹکتی ہوئی ڈاکخانے چلی گئیں۔ کئی دن بعد انتہائی ڈرامائی طور پر یہ ان کے پرس سے اس طرح نکلا جیسے لیٹر بکس سے خط۔ احتیاطاً ہم دونوں اسے ایک ساتھ پوسٹ کرنے نکلے۔ ان کی راستے ہی میں شروع میں جانے والی خریداری سے واپسی کے بعد، ہم پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ آخر یہ تاریخی خط کب تک اسی طرح ہمارا پیچھا کرتا رہے گا۔

خیر میں تو ڈاک میں خط ڈالنا ہی بھولتا ہوں لیکن یار لوگ تو دوسروں کے یہاں سائیکل، جھولا، چھتری اور چھڑی تک بھول جاتے ہیں۔ چھڑی، سائیکل اور جھولا تو آدمی انتخابی دوروں کی حد تک یاد بھی رکھ سکتا ہے، مگر چھتری یاد رکھنا عملاً ناممکن ہے۔ مجھے چھتری لے کر چلنے کا اس طرح شوق ہے جیسے دل پھینک نوجوانوں کو گرل فرینڈ کا۔ چھتری کھونے کی رفتار سے میں خریدتا بھی رہتا ہوں مگر میں کہیں بھی جاؤں، ہر واپسی پر ایک اور چھتری گمشدگی کی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ علاوہ میری اس پھٹی پرانی چھتری کے، جسے چور تک بڑے خلوص سے واپس کر جاتے ہیں اس میں تیلیاں اور کپڑا تقریباً نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ چھتری سے زیادہ چھڑی کا کام دیتی ہے۔ دن میں ان سے بچے گھوڑا گھوڑا کھیلتے اور پٹتے ہیں، رات میں اس سے میں کتے بھگانے کا کام لیتا ہوں۔

پھر بھی بارش اور دھوپ سے بے تعلق اگر یہ پرانی چھتری کھو بھی جائے تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوگی جتنی ریل یا بس پر بکس اور بستر بند تک بھول جانے والے مسافروں کو ہوتی ہے۔ اسٹیشن پر ایک بار دو ٹرینوں اور دو باراتوں کا کراس ہوا۔ سامان بدل جانے کی وجہ سے باراتی بے حد پریشان اور دولھا میاں پسینہ پسینہ تھے۔ میں نے ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا: آپ لوگ کیا چیز بھول گئے؟ دولھا میاں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"اجی بھولے سے دلہن بدل گئی ...!"

کہا جاتا ہے کہ بھولنے والے اچھی یادداشت نہ رکھنے کی وجہ سے بالکل ہی معمولی لوگ رہ جاتے ہیں جبکہ اچھی یادداشت رکھنے والے بڑی ترقی کرتے ہیں مگر مجھے تو اچھی یادداشت رکھنے والے ہی زیادہ معمولی لوگ نظر آتے ہیں۔ ایران و توران کی اڑانے والے بے کار بوڑھے، اچھے وقت اور ایک ہی قسم کے قصوں کو یاد کرنے والے سماج کے کمزور لوگ، معلومات کا سمندر کہلانے والے ناکام ادیب، فلم میں کام نہ ملنے والے اکسٹرا، اور محلے کی سطح کے سیاسی نیتا ذرا کم ہی

کچھ بھولتے ہیں۔ انھیں اپنی ایک ایک ناکامی حفظ ہوتی ہے۔

آپ کسی بھی کام یاب ادیب کو دیکھیے اسے معلوم ہی نہ ہوگا کہ دنیا بس آخر ہو کیا رہا ہے؟ کسی بڑے سیاسی لیڈر کو دیکھیے اس کا ہر بیان بھولنے کی وجہ سے اپنے پچھلے بیان کے خلاف ہوگا۔ یا خود اس کے خلاف۔

ایسی صورت میں، میں یہ دعویٰ کرنے کی ہرگز ہمت نہیں کر سکتا کہ میری یادداشت ذرا بھی اچھی ہے۔ میں بھی دوسروں کی طرح ہر بات بھول جاتا ہوں۔ کئی بار تو یہ تک بھول چکا ہوں کہ میں کون ہوں اب مجھے یہ نہیں یاد آرہا ہے کہ میں آخر آپ سے کہہ کیا رہا تھا؟"

تھرڈ کلاس گڈ بائی

معلوم نہیں تیسرا درجہ زیادہ پرانا تھا یا خود ریل گاڑی، لیکن پہلی بار تھرڈ کلاس دیکھ کر لوگوں نے ریل گاڑی پہچانی تھی۔ جسے پہلی اپریل کو ایک سرکاری معاشی مذاق کے تحت سیکنڈ کلاس میں اس طرح تبدیل کر دیا گیا، جیسے جنس بدل دی جائے۔ کلاس بدلنے کا سرکاری مذاق کوئی نیا نہیں ہے۔ دل بدلی کے ساتھ آنکھیں بدلتے ہی سیاسی لیڈر ممبر سے منسٹر تک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے درجے کے بدلنے والے کا سوائے دل کے سب کچھ بدل جاتا ہے۔ آمدنی و بدعنوانی جو بڑھتے وہ نفع ہیں۔

سیاسی دل بدلی کی بداخلاقی سنجیدگی سے کی جاتی ہے جبکہ کلاس بدلی غریبوں سے مذاق ہی مذاق میں کی گئی ہے۔ سیکنڈ کلاس کی روح قبض کر کے تھرڈ کلاس کا "سیکس" صرف اس لیے چینج کیا گیا ہے تاکہ تھرڈ کلاس والوں سے آج نہیں تو کل، سیکنڈ کلاس کا کرایہ اینٹھا جا سکے۔

تھرڈ کلاس کو سیکنڈ کلاس میں اس طرح تبدیل کر دیا گیا جیسے سوتی کپڑے پر ادنی کا لیبل لگا دیا جائے۔ سیکس چینج کرنے کے باوجود ریل کا تیسرا درجہ لاکھ سیکنڈ کہلانے پر بھی نہ اب تیسرا درجہ ہے، نہ دوسرا۔ مذکر سے مونث کرنے کے بجائے ادھورے آپریشن نے اسے بالکل مخنث بنا دیا ہے۔

کلاس تو وہی تھرڈ ہے جس کا کرایہ تابڑ توڑ ضمنی بجٹوں کے ذریعے ریلوے پرانے سیکنڈ سے کچھ زیادہ ہی کر کے دم لے گی۔ جس کے لیے اس نے فی الحال

چاک یا سفیدے سے سیکنڈ لکھوا دیا ہے یا تھرڈ کا ایک ڈنڈا غائب کر دیا ہے۔

ریلوے کے بوجھ بجھکڑ ریلوے بورڈ کو داد دیجیے کہ اس نے خراب چاول، پلاؤ کے نام پر مرغکوں کو پیش کر دے کہ اسے زہر مار کرنے کے بعد یہ نہ پوچھیں کہ جس کو چاول کہتے تھے، وہ کہاں غائب کر دیے؟

اس حادثے سے میرے جیسے ان گنت وہ لوگ متاثر ہیں، جو خود انتہائی تھرڈ کلاس زندگی، اس تھرڈ کلاس دنیا میں گزارنے کی وجہ سے بالکل تھرڈ کلاس ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی طرح زندگی کے ہر امتحان میں تھرڈ ڈویژن میرا بھی پیچھا کرتی آتی ہے۔ میں زندگی بھر تھرڈ کلاس میں سفر کرتا رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ بلا تھرڈ کے میں سفر کیسے کروں گا؟

جس طرح دنیا میں آنے کے واقعات تیسرے درجے سے ملتے جلتے ہیں، اسی طرح دنیا میں رہنے والوں کا سہارا ابھی یہی تھرڈ کلاس تھا۔ جس میں ان غریب غربا کی اکثریت، کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ تکلیفیں اٹھا کر لمبے لمبے سفر کیا کرتی تھی۔ مفلسی کا یہ سہارا ان سفید پوشوں کے لیے بھی تھا، جن کو خوش فہمی سے پیٹ بھرے تک، کھاتا پیتا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ریلوے کا ذریعۂ آمدنی بلکہ بالائی آمدنی تک سب سے زیادہ اسی تیسرے درجے سے ہوتی۔

پارلیمنٹ میں ریلوے بورڈ کے ایسے ہی کسی شبدے پر، جس میں کام کم اور کمال زیادہ تھا بلکہ خرچ زیادہ تھا — لے دے کے دوران کسی زندہ دل ممبر نے اسے "سفید ہاتھی" اور "اڑیل ٹٹو" جیسے متنازعہ القاب سے نوازا تھا۔ خیر اس زمانے میں کون کس کو گدھا کہہ سکتا ہے، کیونکہ سب دھان بائیس پنسیری کے۔ بہرحال ریلوے بورڈ نے بیک جنبش فاؤنٹین پن، تھرڈ کلاس کو سیکنڈ کے معزز لقب سے سرفراز فرما دیا۔ لیکن ہم اس کی شان میں کوئی گستاخی اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اس کی اس قسم کی دور کی کوڑیاں ہمارے لیے کوئی نئی نہیں ہیں۔ ہم یہ بھی پسند نہ کریں گے کہ تھرڈ کلاس

کے آواگون کا سہرا ریلوے بورڈ کے اُس وقت تک بندھتا رہے، جب تک وہ عوام کو بھیڑ بکری کے بجائے اشرف المخلوقات یا کم از کم آدمی نہ سمجھنے لگے اور مسئلہ تناسخ کی اُس بلندی پر نہ پہنچ جائے، جہاں سے وہ یہ اعلان کر سکے کہ آج سے ریل گاڑی نام بیل گاڑی یا گدھا گاڑی" اور ریلوے بورڈ کا نام بیل، اور گدھے کی رعایت سے بیلوے بورڈ یا گدھا بورڈ رکھا جاتا ہے۔ دراصل نام بدلنا ریاضی کا کھیل ہے۔ ریلوے بورڈ کے ریاضی کے اس معمے نے ہی سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس دونوں کو ملک بدر کر دیا ہے، کیونکہ تھرڈ نہ ہوتے ہوئے موجود ہے اور سیکنڈ موجود ہوتے بھی غائب ہے۔

ابھی تک سیاسی پارٹیوں، ٹریڈ یونینوں، لیڈروں، اساتذہ، طلبہ، ڈاکٹروں اور انجینیروں وغیرہ میں سے کسی نے بھی، سیکنڈ کلاس کی واپسی کا مطالبہ کر کے دفتر، کارخانے یا کلاس میں جانے، پڑھنے، لکھنے یا کام کرنے سے انکار نہیں کیا ہے۔ لیکن کسی بھی وقت اس بنیاد پر تحریک چھیڑی جا سکتی ہے کچھ دن ہوئے کسی سیاسی پارٹی نے اپنا ریڈیو اسٹیشن چالو کرنے کی انتخابی دھمکی دی تھی۔ اس سے پہلے اس نے انقلاب کی دھمکی دی تھی۔ اگر اس نے اپنی ریل چلانے کی دھمکی دی ہوتی تو ہمیں یقین ہے کہ اس چلتے پھرتے انقلابی پروگرام میں تھرڈ اور سیکنڈ کلاس کی بحالی بھی شامل ہوتی۔ مگر اس سے پہلے اپنے آپ کو بحال کرنا پڑتا ہے۔

دلچسپ تضاد یہ ہے کہ ریلوے نے سیکنڈ کلاس کو نام کی تبدیلی کی حد تک تیسرے سے دوسرا درجہ کیا ہے۔ اب یہ بیٹھنے والے کی قسمت ہوگی کہ اُسے جگہ پرانے سیکنڈ میں ملتی ہے یا نئے میں۔ بیٹھنے والا جہاں بھی بیٹھے گا، ہوں گے اس کے ساتھ وہی ہمارے آپ کے جیسے تھرڈ کلاس لوگ، جنھیں عرفِ عام میں عوام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جن سے ہر قسم کی امیدیں اور توقعات باندھ کر ہمیشہ ہر طرح سے نظر انداز اور بلیک میل کیا جاتا ہے۔

اس میں سب کچھ وہی ہوگا، سوائے دل کی اس تسلی کے سامان کے کہ ہم سیکنڈ میں سفر کر رہے ہیں۔ ہاں ہاں! سیکنڈ میں! اور ماشاءاللہ سے سفر کی حد تک اب ہمارا بھی شمار دوسرے درجے کے لوگوں میں ہے۔

اب بھی وہی تیسرے درجے کی بھیڑ بھاڑ، جگہ کی تنگی، زحمتوں اور دشواریوں کے وہ مزے جو عام آدمی کی تقدیر کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں، وہی رہیں گے۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ عام آدمی یہ سارے مزے جن ڈبوں میں اٹھایا کرتا تھا، اُن کا اسمِ گرامی اب خیر سے سیکنڈ کلاس ہوگیا ہے۔ جو تمہید ہے اس بات کی، کہ مستقبل قریب میں تھرڈ کلاس والے کو سیکنڈ کلاس کے نام پر تقریباً فرسٹ کلاس کا کرایہ بھگتنا ہوا کرے گا۔ اس قسم کے اضافے اپریل فول کے موقع پر ہوتے رہیں گے، چونکہ یہ اور آئندہ اسی پائے کی انقلابی تبدیلیاں مذاق ہی مذاق میں ہوتی رہیں گی۔ جن پر اعتراض کیا جا سکتا ہے نہ احتجاج، مگر مذاق ضرور اُڑایا جا سکتا ہے۔

ہنسی مذاق میں ریل کی ترقی نے اسے مذاق بنا دیا ہے۔ مثلاً لیٹ گاڑیاں آنے یا نہ آنے میں ترقی، حادثوں میں ترقی، بدانتظامی میں ترقی اور وہ سب ترقیاں جن کو آپ صرف سُن یا پڑھ سکتے ہیں مگر خود ریل میں نہیں دیکھ سکتے۔

تھرڈ کلاس کا تصور جب بھی ذہن میں اُبھرتا ہے۔ تو بے اختیار ریل میں سفر کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ وہ مزا فرسٹ یا سیکنڈ میں کہاں جو تھرڈ کے سفر میں آتا ہے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والے کچھ عجب کٹے کٹے سے نظر آتے ہیں۔ سیکنڈ والے تو پتا ہی نہیں چل پاتا تھا کہ ہیں بھی یا نہیں۔ مگر تھرڈ میں تو معلوم ہوتا تھا کہ میلہ لگا ہوا ہے۔ ہر طرف ہل چل، شور و غل، لڑائی جھگڑا، زندگی سے بھرپور درجہ، تھرڈ میں سفر خالہ جی کا گھر نہیں۔ اس میں جگہ بنانا مشکل۔ بنائے رکھنا تقریباً ناممکن؛

جس طرح زندگی کے سفر میں ہر شخص اپنی جگہ آپ بناتا ہے، اسی طرح

تیسرے درجے میں بھی، جو تھرڈ کے دھکّے سہہ جائے، اسے زمانے کی لائینوں سے کوئی باہر نہیں کر سکتا۔ زندگی کی عملی تربیت اسی میں ملتی جو اس درجے کو برتنے میں کامیاب رہتا۔ سمجھیے مار لیا اس نے زندگی کا پالا۔

تیسرے درجے میں ہر ہر مضافاتی اسٹیشن تک یہ یلغار ہوتی ہے۔ پہلے لوگ ہٹلی یا لیٹ کر سفر کرتے، پھر بیٹھ کر، پھر کھڑے ہو کر، پھر تقریباً ایک دوسرے کے کندھوں اور سروں پر سفر طے کرتے۔ اوپر یہ چلتے، نیچے ریل۔ دورانِ سفر نہ سونا ممکن، نہ بیٹھنا، کھڑے ہیں تو اٹینشن کھڑے رہیے۔ اِدھر آپ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے یا درمیان میں ذرا بھی کھسکے اور آپ کا پانو، یا ہاتھ یا مجسّم، آپ کسی کے منھ یا پیٹ میں داخل یا پیٹھ پر سوار۔ اوپر سے سمندِ ناز پہ تازیانہ کہ روشنی غائب، ہوا غائب، نظر چوکی تو مال بھی غائب۔ مگر مہنگائی اور مصیبت کے مارے پیارے سوشلزم کے مسافر عوام، آلو کے بورے کی طرح ڈبے میں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ریلا جس طرح آتا ہے اُس طرح جاتا بھی ہے۔ کبھی ڈبہ کھچا کھچ بھر گیا تو کبھی ہُو کا عالم۔ معلوم ہوا کہ پورے ڈبے کے آپ تنہا مسافر۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ کہ ڈبے میں کہاں کہاں بیٹھیں، لیٹیں یا ٹہلیں، یا ڈر کے مارے دروازے، بجلی بند کر کے، ایک کونے میں دبک رہیں۔ کیونکہ بے ٹکٹ بارات تو اتر گئی۔ پر نیا ہم سفر نہ چڑھا۔

تھرڈ کلاس سے آپ سودا بیچنے کا فن سیکھ سکتے ہیں۔ چنا جور گرم، پیٹا مُرمُرے نمکین، ملکوتے، پاپڑ، سموسے گرما گرم، کیلے، تربوز کی پھانک، گنّے کی گنڈیریاں ریوڑیاں، ککڑی، کھیرا، لڈو رام دانے کے دانت کا منجن، آنکھ کا سرمہ ہر قسم کے صابن، تیل، قانون فوجداری، ہندو چائے، مسلم چائے، چائے، غرض کیا نہیں بکتا۔ ہر سودے والا ایک سے دوسرے اسٹیشن کے درمیان بانگیں دکھا، اگلے تھرڈ میں داخل ہو جاتا ہے۔ تھرڈ کے باہر پلیٹ فارم پر اندھے فقیر اور بیراگی گا کر، نٹ تماشے دکھا کر۔ چائے، کافی، پوری، ترکاری

گرم مسالے دار، کھانا، ناشتہ، پان، بیڑی، سگریٹ، کھلونے، اخبار کی صدائیں لگانے والے، پھیری لگاتے کوئی خالی ہاتھ نہ جاتا۔ زیادہ تر غریب یا ان کے بھیس میں اسمگلر تھرڈ کلاس میں رونق افروز رہتے علہ یا دوسری ناجائز اشیاء کی رکھوالی یا پکڑے جانے کے خوف سے کسی بھی اسٹیشن پر یہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ زندگی کے اس میلے میں غریب غرباء سب سے آگے رہتے۔ جو دل کے امیر اور خوانچے والوں کی چکنی چپڑی میں آکر بالکل ہی غریب ہو جانے کے بعد بھی بہت رئیس معلوم ہوتے۔ دس پیسے کا پتہ چاٹنے کے بعد ان کے چہرے پر وہی اطمینان و سکون نظر آتا جو سیٹھوں کو لاکھوں روپے ناجائز کمانے کے بعد بھی میسّر نہیں۔

میرا کہنا تو یہ ہے کہ سیکنڈ کلاس میں بھی سب کچھ وہی ہو رہا ہے، جو تھرڈ میں ہوتا آتا ہے۔ سوائے ڈبے پر لکھے اُن تین ڈنڈوں کے، جن کے اب ہم عادی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈنڈا ہڑتالیوں اور مسافروں سے نپٹنے کے لیے ریلوے بورڈ نے سنبھال کر رکھ لیا ہے

اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ زندگی کب ریل کی طرح تھرڈ سے نمائشی یا اصلی سیکنڈ کلاس میں بدلے گی۔ تبدیلی۔ کاغذ ہوا پہ ہو گی یا سچ مچ؟ مگر اس سب کے لیے پریشانی یوں نہیں کہ سوشلزم اور امید پہ دنیا قائم ہے۔

سڑک کا گھیراؤ

سڑک کا گھیراؤ جس نے پہلے پہل کیا ہوگا، وہ ضرور کوئی دکان دار ہوگا۔ دکان دار اصل دکان سے گزوں آگے بڑھ کر دکان نہ لگانے کو ذاتی توہین سمجھتے ہیں۔ بھلا وہ دکان دار کیا جو فٹ پاتھ تک دکان میں شامل نہ کر سکے۔ جو دکان دار جتنا بڑا ہوتا ہے، وہ اتنی ہی زیادہ سڑک گھیر لیتا ہے۔ پٹڑوں، تختوں اور شوکیسوں کی آڑ میں اچھی خاصی سڑک اس کی جیب میں آجاتی ہے۔

سڑک کے ساتھ راہ گیروں کا وہی حشر ہوتا ہے، جو گیہوں کے ساتھ گھن کا۔ راہ گیر دکانوں کے سامنے سے نہیں گزرتے، بلکہ انھیں پھلانگتے ہیں۔ ایسا یہ مجبوراً کرتے ہیں۔ یہ مجبوری اکثر انھیں راہ گیر سے گاہک بنا دیتی ہے۔

بچے کھچے فٹ پاتھ کا گھیراؤ، پٹری دکان دار کرتے ہیں۔

یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ سڑک کے اس گھیراؤ کے دور میں لوگ فٹ پاتھ پر بھی چلتے ہیں۔ چلتے نہیں بلکہ ٹریفک کے خوف یا ریلے سے اسی طرح اس پر نازل ہوتے ہیں جیسے لہر یا جوار کے ساتھ مچھلی پانی سے خشکی میں پہنچ جائے۔ پہنچنے والا اگر نٹ یا سرکس کا طویل عملی تجربہ نہ رکھتا ہو، تو پریشانی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسے بڑی اور چھوٹی دکانوں کے گھیراؤ شدہ علاقے پھلانگ کر طے کرنا ہوتے ہیں۔ دکان اور دکان دار دونوں کے اوپر سے چکر کاٹ کر ہوائی جہاز کی طرح گزر جانے کے خطرات سے قطع نظر، اگر خریداری کے لیے وہ رُکنا بھی چاہے، تو ممکن ہے کہ دوسرا گاہک اسے سائیکل اسٹینڈ کے طور پر استعمال

کرے یا کوئی دم لینے کے لیے اپنا بھاری گٹھر اس کے سر پر منتقل کر دے۔ یا اس کی جیب صاف کر دے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ تعجب صرف اس پر کیا جا سکتا ہے کہ آپ فٹ پاتھ سے بہ خیریت گزر جائیں۔

سڑک کا گھیراؤ اس کے آگے دن میں ٹھیلے والے اور رات میں کتے کرتے ہیں۔ کتوں کے اس فعل کا تعلق سڑک سے زیادہ خودکشی سے ہے۔ جس میں اگر کوئی مخلل ڈالنے کی کوشش کرے تو اسپتال پہنچا دیا جائے۔ ٹھیلہ اگر چاٹ والے کا ہے، تو اس کے چاروں طرف پتے چاٹنے والوں کا ہجوم ہوگا، جسے اگر ان چلتی پھرتی دکانوں اور گھیراؤ کا حصہ سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سڑک کا گھیراؤ کرنے والی چلتی پھرتی دکانوں میں سائیکل سے ٹرک تک بطور شوکیس استعمال کیے جاتے ہیں۔ کپڑے، تیل، مسواک، میوہ، گرم مسالے سب کچھ سائیکل دکان دار کھڑے کھڑے بیچ لیتے ہیں۔ ٹرک پر بک ڈپو سے لے کر اسپتال اور سینما تک نظر آ جائیں گے۔ ٹرک نما دکانیں بہ آسانی سڑک کا چوڑائی میں انتہائی کامیاب گھیراؤ کر لیتی ہیں۔

بڑھتی ہوئی دکانوں سے لے کر چلتی پھرتی دکانیں تک، سڑک کا اتنا زیادہ گھیراؤ کر لیتی ہیں کہ پھر گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کا گزرنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

سڑکوں کو گھیراؤ سے بچانے کا اوّلین فرض ٹریفک کا سپاہی انجام دیتا ہے۔ دراصل یہ سڑک کو بچانے کے بجائے اس پر سے زندہ سلامت ٹریفک گزار دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کی ذرا بھی نگاہ چوکنے یا اونگھنے پر ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ اس کے مددگار سڑک کو گھیراؤ سے روکنے کے لیے رکشے و ٹیکے والوں کو ڈنڈوں سے مار کر ٹمپو والوں کو ڈنڈے دکھا کر، موٹر نشینوں اور اسکوٹر موٹر سائیکل والوں کو سلام کر کے، سڑک صاف کراتے رہتے ہیں۔

دراصل سڑک کا گھیراؤ کرنے والوں پہ ان کا نزلہ بہ اعتبار حیثیت گرتا ہے، یعنی خوانچے والوں کی پٹائی و گرفتاری، بڑی دکان داروں پر زبانی سختی اور بڑے

دکان داروں سے سلام دعا۔ اس طرح اصل سڑک گھیرنے والے بڑے دکان دار اور موٹر نشین سڑک کے گھیراؤ کے لیے بالکل آزاد رہتے ہیں، جس کی وجہ سے گاڑیاں راہ گیروں پر سے اور راہ گیر گاڑیوں کے اوپر سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمند ناز پہ تازیانے کا کام بے وقت نکلنے والے جلوس کرتے ہیں جنھیں سوئی کے ناکے میں سے اونٹ گزارنے کی ایک اور کوشش کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ گاڑیوں اور راہ گیروں کے ایک دوسرے کے اوپر سے نکلنے میں ناکامی سے بار بار ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ موٹریں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ پیدل آگے نکل جاتے ہیں۔

سڑک گھیرنا کسی زمانے میں آرٹ ہوگا۔ اب تو اس کا شمار سائنس میں ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ سائنس بھی نیوکلیائی ہوگی۔ فی الحال تو اس سائنس سے گزارنے والوں کو گاہک بنانے کے تجربے کا کام لیا جا رہا ہے۔ تجربے کی کامیابی نے ٹریفک کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ یا تو آسمان سے گزرے یا پاتال سے۔ لیکن سڑک سے نہیں گزر سکتی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر زیرِ زمیں اور بالائے زمیں راستے بنائے جا رہے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسے راستے جہاں بنائے جاتے ہیں وہاں سڑکیں نہیں گھیری جاتیں۔ جہاں سڑکوں کو گھیراؤ کیا جاتا ہے، وہاں اوپر نیچے مزید گھیراؤ کے خوف سے راستے نہیں نکالے جاتے۔

جس محلے میں ہے ہمارا گھر

جس محلے میں ہے ہمارا گھر، وہیں بقول مرزا شوق دہلوی رہتا ہے۔ ایک سوداگر ہمیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ شوق مرحوم کے زمانے میں ضرور اس علاقے میں کوئی سوداگر رہتا ہوگا۔ مگر اب تو واقعی، لوگ کم رہتے ہیں اور سوداگر زیادہ گھروں کے آگے یہاں یادش بخیر کبھی ڈرائنگ روم، دیوان خانے اور مہمان خانے ہوا کرتے تھے۔ ان کے بجائے اب دکانیں اور صرف دکانیں ہوا کرتی ہیں۔ اور دکانیں بھی ایسی کہ گھر کے سامنے دکانیں، گھر کے پیچھے دکانیں، گھر کے دائیں دکانیں، گھر کے بائیں دکانیں، یہاں تک کہ گھر کے اوپر اور نیچے دکانیں۔ چنانچہ ہمارا گھر اچھا خاصا بساط خانہ اور محلہ بازار معلوم ہوتا ہے۔ غرض جب ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک نظم

بے اختیار یاد آجاتی ہے۔ جس میں ٹیپ کا

بند تھا۔

بس فرق یہ ہے کہ اس فوجی بریگیڈ کے چاروں طرف توپیں ہی توپیں اور اس کشتۂ بازار کے ہر طرف دکانیں اور بس دکانیں ہیں۔

ان دکانوں میں دکان داری سے زیادہ شور و غل کی آوازیں دن تو دن، رات تک میں ہمارا جینا اور سونا دوبھر کیے رہتی ہیں۔ یہ آوازیں مول تول سے لے کر بارپیٹ

اور ریکارڈنگ تک کی ہوتی ہیں۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر اب ہم ان دھماکوں، ہنگاموں اور آوازوں کی دنیا کے شور شرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر ٹھیک سے شور نہ ہو رہا ہو تو آرام سے سو نہیں پاتے، اور اگر بازار وغیرہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ سناٹا ہو تو عجب الجھن اور بے چینی سی رہتی ہے۔

مگر اس شور وغل کے فائدے بھی ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ہمارے ایک عزیز مع اپنے خاندان، لکھنؤ کی سیر کے لیے ہم پر اس طرح نازل ہو گئے جیسے گنہ گاروں پر عذاب اور کمزوروں پر موسمی بخار۔ ہم اس مہنگائی میں مہمان داری کے بوجھ سے دبنے ہی والے تھے اور ہمارا بجٹ فیل ہونے میں کوئی خاص کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ ہمارے معزز مہمان نے دو، دن اور دو رات مسلسل شور وغل کی وجہ سے سو نہ سکنے کے بعد، اپنا بوریا بستر باندھا اور شہر کے باہر ڈاک بنگلے میں قیام کے لیے ہمارے ظاہری روکنے کے باوجود چل دیے اور ہمارا بجٹ فیل ہونے سے اور ہم محض اس دن رات کے شور کی وجہ سے، بال بال بچ گئے۔

اس شور وغل سے ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہمیں صبح صبح بلا اخبار پڑھے دنیا جہان کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اہم خبر کے بارے میں مختلف قسم کی رائیں اور بے لاگ تبصرے مل جاتے ہیں، کیونکہ زیادہ تر کاروباری حضرات، اخبار بھی اس طرح پڑھتے ہیں گو یا اخبار پڑھ نہیں چلا چلا کر بیچ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ پاس پڑوس کے لاتعداد ریڈیو، ٹرانسسٹر، پل پل کی خبریں ہمارے کانوں میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ فجر کی اذانوں کے بعد ہمیں صبح سے رات گئے تک عام طور پر اور خاص طور پر تہوار تقریب کے موقع پر، دن بھر کے علاوہ رات بھر بھی، بالکل مفت تازہ ترین فلمی گانے اور فرمائشی پروگرام سنائی دیتا ہے۔

کرکٹ میچ کی کمنٹری، ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کے موقع پر جشن جمہوریہ

کے پروگرام، اہم اعلانات اور بازار کے بھاؤ کے لیے ہمیں کبھی کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا، ہم اپنے معمولات میں مصروف رہتے، مگر ہر پروگرام کی تفصیلات سے خود بخود آگاہ بھی ہوتے رہے۔

اسی کے ساتھ ایک زبردست فائدہ گھر میں بازار لگنے کا یہ بھی ہے کہ ہمیں ہمیشہ معلوم رہتا ہے کہ کون سی چیز بازار سے غائب ہے؛ کس چیز کے دام چڑھے یا گرے، کون چیز کہاں اچھی ملتی ہے اور کون کہاں خراب۔

چونکہ ہمارا گھر بیچ شہر میں واقع ہوا ہے، اس لیے ہمارا ہر عزیز، شناسا اور جگری دوست، خواہ کہیں بھی رہتا ہے، مگر شہر کے اس بارونق بازار کا ضرور رُخ کرتا ہے۔ اور جو لوگ یہاں تک آجاتے ہیں وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے غریب خانے کو بھی رونق بخش جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ جناب کرایے اتنے مہنگے ہیں اور رکشا والے، ٹیکسی والے کا کرایہ میں مقابلہ کرتے ہیں، ہم کرایے اور آنے جانے کی زحمت اور خرچ سے بالکل صاف بچے رہتے ہیں کیونکہ جائیں تو جائیں کہاں۔ سب تو خود یہیں آجاتے ہیں۔

آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو محض وقت گزارنے یا اُدھار مانگنے آتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو کھڑے آتے ہیں اور الٹا ہم ہی سے پوچھ لیتے ہیں: "ہمارے لائق کوئی خدمت؟" تو ہم اس آخرالذکر قسم کی مخلوق سے ملنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو خیر سے مخلص کے علاوہ خدمت گزار بھی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا جن لوگوں سے ہم نہیں ملنا چاہتے، فوراً پردے کی آڑ میں سے زنانی آواز بنا کر خود ہی کہہ دیتے ہیں۔

"میاں! بھیا نہیں ہیں!"

اور اگر کسی نے کہا۔

"کون ہو؟ باہر تو آؤ!"

تو نہایت عاجزی کے ساتھ کہتے ہیں۔

"میاں! کیسے آ جائیں؛ پردے دار جو ٹھہرے۔"

اس کے بعد وہ غریب لاجواب ہو کر رفوچکر ہو جاتا ہے اور جب بھی راہ نئے گلی، ان سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ "جناب والا کے دولت خانے پر حاضر ہوا تھا، تو ہم بڑی لاعلمی کے ساتھ دریافت کرتے ہیں۔ "کب؟"

اور جب وہ گا چکتا ہے تو اسے کل پھر بلاتے ہیں۔

ہمارے بہت سے دوستوں کو حیرت ہے، بلکہ تعجب ہے کہ آخر ہم سینما کیوں نہیں دیکھتے۔ لیکن شاید انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اتنے فلمی ماحول میں دن رات رہنے کے بعد، فلم دیکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، صبح و شام، دن رات اپنے محلہ اور پڑوس نما بازار کے مکالمے، گانے اور مُفت کی موسیقی سننے کے ساتھ ساتھ ان کی گھریلو اور بازارو مار دھاڑ والی زندگیوں کی پوری پوری ٹاکی فلمیں اور آنے والی فلموں کے ٹریلر تک سننے کو مل جاتے ہیں اور جس کے بعد الگ سے سینما دیکھنا آخر بدمذاقی نہیں تو پھر کیا ہے؟

پھر بھی آخر میں ہم یہی عرض کریں گے کہ غرض زمانے کو دیکھتے ہوئے، جہاں بھی ہمارا گھر ہے، بہت غنیمت ہے جس کے لیے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ خدا اسے آباد اور ہمیں شاد رکھے۔

پورٹ فولیو

پورٹ فولیو سے اگر آپ کی مراد قلم دان یا قلم دانِ وزارت سے ہو، تو آپ سخت غلطی پر ہیں۔ قلم دان کا تعلق تو براہِ راست روشنائی، قلم، پنسل اور قلم تراش وغیرہ سے ہوا کرتا ہے یا پھر اُسے استعمال کرنے والے سے، جب کہ قلمدانِ وزارت کا تعلق، محکموں سے زیادہ اور قلم سے کم ہوتا ہے اور اس سے بھی کم اسٹیشنری سے۔

پورٹ فولیو یعنی دستی بیگ بھی فی زمانہ انواع واقسام کے ہوتے ہیں۔ ستار کیس سے لے کر بریف کیس تک اور گنی بیگ سے منی بیگ تک یوں تو سب کو بیگ ہی کہتے ہیں، مگر بیگ تو وہ بھی ہوتا ہے جس میں جابی کا گچھا لگا ہوتا ہے اور وہ بھی جس میں صرف ایک جابی ہوتی ہے۔ منہ دیکھنے کا آئینہ یا تھوڑا سا ریزگاری کا چورا۔ اور وہ بھی ہے بیگ، جس میں خواتین سامانِ آرائش سے لے کر کپڑے کا تھان تک رکھ لیتی ہیں اور حضرات بازار سے سودا ترکاری لاتے ہیں۔ آپ کہیں گے ترکاری تو جھولے یا باسکٹ میں لائی جاتی ہے، مگر اس کو کیا کہیے گا کہ جھولے اور ٹوکری کے ساتھ غربت کا جو قومی تصور چپکا ہوا ہے، اسے چھڑانے کے لیے انھیں تک، بیگ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں بلکہ اب تو بیگ کے نام سے ایسی فیشن میں چار چاند لگانے والی ٹوکریاں، جھوے اور جھولے نظر آتے ہیں جن کے مقابلے میں خود بیگ بے چارے، جھولے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بیگ بھی غریبی کی طرح اتنے بڑھتے اور پھیلتے جارہے ہیں کہ ان کے مقابلے میں بڑے بڑے بکس، ہولڈال

بورے تک، سچ نظر آتے ہیں۔ آخر اس کو بھی ہم بیگ ہی کہتے ہیں جس کو دور ہی سے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ صاحب بیگ کسی یونیورسٹی میں پروفیسر، کسی کمپنی کے انشورنس ایجنٹ یا دوا فروش ہیں۔ اور معلوم ہو جانے پر بھی یہی یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ نہیں یہ شخص پروفیسر نہیں، انشورنس ایجنٹ ہے۔ اور دوا فروش پہ پروفیسر کا گمان گزرتا ہے ورنہ میجک پروفیسر کا۔ اگر وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے تو ضرور کسی فلک زدہ سیاسی پارٹی کا نوآموز کارکن نما لیڈر ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ فی زمانہ جو کچھ نہیں ہو پاتا، وہ لیڈر ہو جاتا ہے۔ لیڈر اگر بڑا ہو جائے تو بالکل خالی ہاتھ ہوتا ہے۔ آخر اسے جب سوائے زبانی وعدوں کے کچھ دینا نہیں ہے تو پھر وہ بیگ ویگ رکھنے کا جھول جھال کیوں پالے۔ لیکن اگر لیڈر بدقسمتی سے ابھر نہ پایا ہو تو پھر بلا بیگ کے اس کی لیڈری تک خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور ڈرتا ہے کہ اگر وہ بیگ لے کر نہ نکلا تو پھر بھلا اسے کون نیتا مانے گا؟

اب تک کی دریافت کے مطابق سب سے خطرناک بیگ ڈاکٹر، ادیب، شاعر اور سرکس کے جوکر کا ہوتا ہے۔ بسا اوقات تو یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ بیگ والا شاعر ادیب ہے، سرکس کا جوکر یا ڈاکٹر، یا تینوں دھندے ایک ساتھ کر رہا ہے۔

پورٹ فولیو، میں اسی دستی بیگ کو کہتا ہوں جو عام طور پر گھر سے نکلتے وقت بطور ٹریڈ مارک میرے ساتھ رہتا ہے جو کہنے کو تو محض ایک بیگ ہے۔ مگر اصلیت میں اس میں ایک دنیا آباد ہے۔ اس اعتبار سے اگر آپ میرے پورٹ فولیو کو قلمدانِ وزارت یا محکمہ نقل و حرکت قرار دیں تو اس لیے بے جا نہ ہوگا کہ آپ کی طرح میں بھی زمانے کو ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہوں۔

شاید کسی کو اس پر اعتراض ہو کہ بھلا آپ بیگ میں سارے زمانے کو کس طرح ساتھ لے کر چلتے ہیں؟ مجھے کہنے دیجیے کہ جب دل و دماغ جیسی چھوٹی سی شے میں سارا جہان سما سکتا ہے تو پھر میرے اتنے بڑے بیگ میں میری چھوٹی سی

کائنات بھی سما سکتی ہے۔

آخر میرے اس پورٹ فولیو میں کیا نہیں ہوتا! کتابیں، نوٹس، کاغذ، لانڈری سے لے کر چندے کی رسیدیں، دنیا جہان کے بل، لاٹری کے ٹکٹ، انواع واقسام کے ادبی معموں کے خاکے، فری گفٹ کوپن اور نہ جانے کیا کیا الم غلم بھرا رہتا ہے۔ ہوتا عام طور پر یہ ہے کہ ہر ضروری کاغذ اور خط اس میں رکھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب کبھی کوئی چیز ڈھونڈنے کے لیے بیگ کو الٹا پلٹا جاتا ہے، تو اس میں بہت سے ایسے ضروری کاموں کی تفصیلات اور خطوط برآمد ہوتے ہیں جن کے انجام دینے یا جواب دینے کا وقت موسم کی طرح گزر چکا ہوتا ہے۔ پھر ان کی اتنی اہمیت بھی نہیں ہوتی جتنی کہ جاڑوں میں برف یا گرمی میں لحاف کی۔ اگر پورٹ فولیو نہ ہوتا تو مجھے اتنے بہت سے کام کرنے پڑتے، جن کے نہ کرنے کا کبھی میں دل میں خیال تک نہ لایا تھا۔

اگر آپ میرے پورٹ فولیو کا جغرافیہ سمجھ لیں تو پھر یہ بات اس چار جیبوں والے پورٹ فولیو کی، آپ کے پوری طرح سمجھ میں آجائے گی۔

میرے پورٹ فولیو میں باہر کی جانب جو جیب ہے، دراصل وہ میرا چلتا پھرتا پوسٹ آفس اور سیونگ بینک ہے جس میں ٹکٹ، پوسٹ کارڈ، لفافے، پیڈ رہتے ہیں۔ بیگ کے اندر ایک اور بیگ یعنی منی بیگ جس میں کالا دھن، اس طرح چھپا ہوتا ہے کہ منی بیگ، بادی النظر میں بالکل خالی اور واقعی کسی ادیب کا پرس معلوم ہوتا ہے۔ بلیک منی اس بالائی آمدنی کا نام ہے جس کا تنخواہ یا الاؤنس سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور جس کی گھر والی کو ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی۔ پھر بھی احتیاطاً ان روپوں کے ساتھ والدہ کی بیماری کا نسخہ بھی رکھا رہتا ہے کہ اگر کبھی گھر میں "وہ" یا باہر کوئی بے تکلف دوست اس پر چھاپا مار دے تو اس شرلک ہومز کے سامنے "آہ واٹسن" کہہ کر نسخہ بطور ڈھال سامنے آجائے۔ پھر اس "وہائٹ"، پر کسی کو "بلیک" ہونے کا شبہ، پکڑے جانے کے بعد تک

نہیں ہو سکتا۔

بیگ کی دوسری جیب میں ایک زپ بھی لگی ہوئی ہے۔ اس پاکٹ میں قلم، پنسل، کان اور دانت کھودنی، وکیس، فیملی پلاننگ، ایک ڈراپر، شہر میں ہونے والی تقریبات کے دعوت نامے اور ریزگاری وغیرہ رکھی جاتی ہے۔ پورٹ فولیو کے اندر دو خانے ہیں۔ ایک اندرونی اور دوسرا باہری۔ اندر کا خانہ بیگ میں دراصل وہی حیثیت رکھتا ہے، جیسی بینک میں اسٹرانگ روم کی ہوتی ہے۔ اس میں ہر ضروری کاشے حفاظت کے خیال سے ہمیشہ رکھتے رہتے ہیں اور آخر میں یہ صورت حال ہو جاتی ہے کہ جو چیز اس میں چلی گئی؛ وہ اس کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہو گئی، جس سے بچنے کے لیے اس میں وقتاً فوقتاً یادداشت پرچے رکھے جاتے ہیں لیکن وہ بھی نئی نسل کے تنہا انسان کی طرح بھیڑ کی تنہائی میں کھو جاتے ہیں۔ احباب کے فون نمبروں کا بھی کم و بیش یہی حشر ہوتا ہے۔ غرض ہمیں نہیں یاد پڑتا کہ کبھی وقت پر اس میں سے کوئی کام کی چیز ڈھونڈنے پر مل بھی سکی ہو۔

پورٹ فولیو کے اندر کا باہری اور آخری خانہ بیک وقت ہر کام انجام دیتا ہے۔ دفتر کھانا اس میں لے جایا جاتا ہے۔ تہوار کا حصہ اس میں رکھکر تقسیم کرنے نکلا جاتا ہے۔ آلو، مٹر، گوبھی سے لے کر انڈا، ڈبل روٹی اور مکھن تک، اس میں لایا جاتا ہے۔ لائبریری سے کتابیں لانے، لے جانے کا فرض یہ انجام دیتا ہے۔ غرض یہ محض بیگ یا اس کا تیسرا خانہ نہیں، بلکہ امرت دھارا ہے۔

اگر پورٹ فولیو نہ ہو تو زندگی محال ہے، بیوی کے بعد بیگ گھر کی گرہستی کا سب سے اہم ستون ہے۔ اگر بیگ نہ ہو تو شوہر بیوی کے نصف کام بھی انجام نہ دے سکے۔ اس لیے صاحبِ بیگ شوہر کو، بیوی کا نصف بہتر کہا جاتا ہے۔

بلا بیگ کے ہم کسی کی شخصیت اور حیثیت کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یکہ، رکشا اور بس سے لے کر موٹر اور ہوائی جہاز تک پر لوگ بیگ لے کر چلتے ہیں۔ بیگ تو کان میلیے اور بس کنڈکٹر کے پاس بھی ہوتا ہے، اور وزیر و کلکٹر کے

باس بھی۔ مگر بیگ خود اپنے سائز کینڈے اور تیور سے بتا دیتا ہے وہ کس کا بیگ ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ بیگ طبقاتی کشمکش کا آئینہ دار ہے

بیگ تاریخ ہے۔ ایک بیگ وہ تھا جس میں سے کاغذ نکال کر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور وہ بھی بیگ تھے جن کو لے کر آزاد کرنے والے اپنے دیس واپس چلے گئے اگر بیگ نہ ہوتا تو کولمبس امریکہ اور فاہیان ہندوستان نہ پہنچتا۔ اور اگر یہ سب بلا بیگ کے کہیں پہنچ بھی جاتے تو آج ہمارے پاس نہ ابنِ بطوطہ کا سفر نامہ ہوتا اور نہ مارکو پولو کے سفر یارے، جن کے نوٹس انھوں نے بیگ ہی میں محفوظ رکھے تھے۔

بیگ تو اخبار نویس بھی رکھتے ہیں، مگر ان میں خبروں، تقریبات کے دعوت ناموں اور سفارشی خطوط کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ اخبار نویس ہے یا اسمگلر۔

بیگ اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت ستانی اور جرائم کی علامت بھی ہے۔ کسی بھی بیگ میں ہیرے سے لے کر افیون تک نکل سکتی ہے اور رشوت کے مال سے لے کر پستول تک نکل سکتا ہے۔ اس لیے ہر شریف آدمی کے بیگ پر ہر پولیس والے اور رہزن کی نظر ہوتی ہے۔ بیگ، امارت و غربت کا عجیب و غریب سنگم ہے جو آزادی کی ان سلور جوبلی تقریبات کے دوران رنگا رنگ ثقافتی تقریبات میں جب کسی اسٹیج پر جمکتا ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری غربت اور خودداری پر یہ ایک بہت بڑا جوتا ہے۔ جسے ہار پھول پہنائے جا رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، اگر پورٹ فولیو نہ ہو تو جینا محال ہے۔ اس لیے اگر کبھی میں اسے لے کر نکلنا بھول جاؤں یا مصلحتاً لے کر نہ نکلوں، پھر مجھ سے اس دوران کوئی کام ممکن نہیں۔ اس لیے کبھی کبھار میں سوچتا ہوں کہ اگر بموں کے حادثے بڑھنے کی وجہ سے پورٹ فولیو لے کر گھر سے نکلنے پر حکومت نے کبھی دفعہ ۱۴۴ لگا دی تو پھر جینے کا ادا کیا ہوگی؟

اور زندہ بھی رہا جا سکے گا یا بیگ کے اندرونی خانہ کی اشیاء کی طرح ہم خود بھی جامد ساکت ہو جائیں گے۔ اسی لیے کم از کم میں بلا پورٹ فولیو کے ایک دن بھی زندہ رہنے کے بارے میں شاید سوچ تک نہیں سکتا۔ مگر ہاں جب بات مرنے اور قیامت تک پہنچ جائے تو یہ سوال ضرور مجھے پریشان کر دیتا ہے کہ دوزخ اور جنت میں پورٹ فولیو بھی رکھنے کی اجازت ہو گی یا خالی ہاتھ بھٹکنا ہو گا۔

جانبداری

جی ہاں پچھلے ہفتہ تک میں بہت جانبدار قسم کا انسان تھا، مجھے وہ لوگ بالکل پسند نہ تھے جن میں اس کی اہلیت نہ تھی۔ میں ان کو ان کے متعلقات سے علاحدہ کرکے نہ دیکھ پاتا تھا، کوئی مجھے کمیونسٹ نظر آتا، کوئی کانگریسی یا مسلم لیگی، کسی کا تعلق میر صاحب کے گروہ سے تھا اور کسی کا خان صاحب کے جھتے بندوں میں شمار ہوتا تھا۔

بھلا بتائیے، آدمی نے ہزارہا سال کے ارتقاء کے بعد سیکھا بھی کیا، وہ اس غار سے نکل کر تہذیب کے رنگ محل میں آباد ہوگیا، اس نے اپنے دماغ سے کام لے کر قدرت پر فتح حاصل کی اور اشرف المخلوقات کہلایا۔ آپ اپنی لاکھ تعریف کریں، مگر ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ جانور سے آدمی بننے کے بعد بھی جانور بنا، باوجود لاکھ پالتو ہونے کے نہ جا سکا، جانور کو اگر سدھا یا جائے تو کسی حد تک اس میں آدمیت کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں، مگر حضرت انسان! توبہ کیجیے بس تھوڑا سا موڈ خراب ہونے کی ضرورت ہے۔ ادھر مفاد ٹکرایا اور اخلاق و اقدار کے قبرستان سے کھڑے ہو کر وہ دھول اڑائی جاتی ہے کہ توبہ بھلی۔ اس جانبدار کلکے خوف سے اس دنیا کی جنگی تاریخ کے اوراق شفق زار ہیں جن کے پیچھے برہنہ انسانیت کی سیاہیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اب تو یہ خونی تاریخ اس فیصلہ کن موڑ پر آچکی ہے، جہاں اب جان سے زیادہ جہان کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

اس جانِ جہاں کے درمیان مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک الکشنی لیڈر کی تقریر پچھلے ہفتے سنی۔ اس لیڈر کو میں سو فیصدی ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ اسے نہ ملک سے پیار ہے، نہ وطن کے مسائل سے لگاؤ، نہ دنیا سے تعلق، دنیا کے کسی عیب سے اس کا دامن پاک نہیں، مگر اس کے باوجود لوگوں نے اس کی باتوں کو بڑے غور سے سُنا، زور و شور سے تالیاں بجائیں، اس پر ایمان لے آئے۔ یہ شخص اسٹیج سے اُتر کر پھر اس دنیا میں کھو گیا جس میں اپنی ذات کے سوا کسی اور رشتے کی گنجائش و گزر نہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ کامیاب ہو گیا اور اسے اگلے الکشن کے لیے فرصت مل گئی۔

اس کے بعد میں بھی ایک دم سے بغیر کسی دعویٰ و دلیل کے جانبدار بن گیا۔ جانبدار کیوں نہ ہوتا۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ وہ مجبور ہے کہ مل جل کر مشترکہ مفاد کے لیے کام کرے۔ اگر انسان میں یہ خوبی نہ ہوتی تو وہ آج بھی اپنے دشمنوں میں گھرا ہوا غاروں اور پیڑوں پر آوارہ بھٹک رہا ہوتا۔ اس نے مل جل کر گروہ کی صورت میں جنگل اور میدان صاف کیے، کھیتیاں لہلہائیں، فصلیں کاٹیں، تازہ بستیاں آباد کیں اور ان سب نے آگے چل کر دیہات، قصبے اور شہر بسائے۔ اگر وہ جانبدار نہ ہوتا تو فضائے بسیط میں اُڑان کی جگہ غاروں میں روپوش ہوتا۔

دنیا میں جدھر دیکھیے جانب داری کا سکّہ چل رہا ہے۔ مذہب، سیاست، تجارت، علم و حکمت کی ہر سڑک جانبداری کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اگر آپ کو بھی اپنوں کا خیال نہ ہو تو پھر کس کو ہوگا، اور یہ خیال جانبدار ہونے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اپنائیت کے احساس کا دوسرا نام جانبداری ہے۔

اگر دنیا سے جانب داری کی نیک روایت اٹھ جائے، تو پھر نہ کوئی جماعت رہ جائے اور نہ اس کا مقصد، نہ کوئی فلسفۂ حیات رہ جائے اور نہ اس کے

پرچار کرنے والے۔ ملک، وطن، صوبہ، شہر دیہات سب علامتیں بے کار اور بے مقصد ہو جائیں۔ سماجی خیر اور بہبود کے ادارے بیشتر تعلیم گاہیں، یتیم خانے، بڑے بڑے ادارے سونے اور ویران ہو جائیں۔

یہ دنیا چند خوش حال حضرات کے حصے میں آئے، جنھیں نہ دوسروں کے غم کا غم ہو اور نہ ان کی خوشی کی خوشی، وہ بالکل غیر جانب دار طریقے سے اس دکھی دنیا سے غیر متعلق ہو کر اپنی ذات میں مگن رہیں۔

افراد کے آپس کے ٹکراؤ اور کشمکش سے جو نئی مبارک قوتیں ابھرتی اور پرانی قوتیں دم توڑتی ہیں اور جس سے اس افسانوی دنیا میں نئی تحریکیں، قوتیں اور رجحان پیدا ہوتے ہیں، ان میں ٹھہراؤ پیدا ہونے کے سبب یہ دنیا بوڑھی بے آب و رنگ، خشک و بے جان ہو جائے۔ جس میں صرف اپنے بارے میں جینے اور مرنے والوں کی ایک طویل فہرست کے سوا کچھ بھی نہ رہ جائے۔

لوگ بڑھانے سے بڑھتے اور گھٹانے سے گھٹتے ہیں۔ اچھوں کو بڑھایا اور بروں کو گھٹایا جانا چاہیے لیکن غیر جانبداری عام ہونے کے بعد جو جہاں ہے پھر وہیں رہ جائے گا وقت اور فاصلے کی علامتیں، فرضی و خیالی داستانیں بن کر رہ جائیں گی۔

مگر یہ ممکن کیسے ہو، "انسان پیدائشی طور پر "جانبدار" ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے تانے بانے سے جدا نہیں کر سکتا۔ اس کی ہر سانس جانب داری کے لمس سے ملوث ہوتی ہے۔ اس کے دماغ کی ہر ترنگ جانبداری کے چمن میں ایک نئی خوشبو سے ٹکراتی ہے۔

بہ حیثیت ایک مکمل اور کٹر جانبدار کے پچھلے ہفتے سے میں غور کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں جانبداری کے نقصانات وقتی اور برائے نام ہوتے ہیں جن کا الزام ہنگامی لمحات اور ناعاقبت اندیشی کے سر بآسانی تھوپا جاتا ہے، مگر اس کے فوائد بے پایاں ہیں۔

میں نے بہت غور کیا مگر ابھی تک میرے ذہن میں ایک بھی پرچھائیں ایسی نہ اُبھر سکی ہے، ایک چہرہ بھی ایسا نظر نہ آسکا جس پر میں یہ تہمت لگا سکوں کے کہ یہ غیرجانبدار ہے، دوست، ملاقاتی، واقف کار، شناسا، نہیں ایک بھی نہیں، سب بھلے آدمی سو فیصدی جانبدار ہیں۔

آخیر میں ایک بات اور بھی بتا دوں اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ میں غیر جانبدار ہوں تو سمجھ جائیے کہ دنیا میں اس شخص سے زیادہ کوئی جانبدار نہیں، خواہ وہ خود ہم اور آپ کیوں نہ ہوں۔

چند لمحے آل پن کے ساتھ

کھانا کھانے کے بعد جب خلال کرنے کے لیے میں نے آل پن سے دانت کریدے، تو اچانک ننھی منی، پیاری سی آواز میرے دانتوں سے نکل کر کانوں میں اس طرح رس گھول گئی جیسے کہیں دور گھونگرو بج اٹھیں۔

"قبلہ میرے علاوہ اپنے حال پر بھی رحم کھائیے۔ اس طرح خدا کے لیے دانت مت کریدیے، کہیں آپ کو سیپٹک، و یپٹک نہ ہو جائے اللہ۔ا!"

میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، مگر مجھے دور دور تک اپنے ارد گرد اور پاس پڑوس میں کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے تقریباً چلا کر پوچھا:۔

"آخر کون صاحبہ مجھے آل پن سے دانت کریدنے سے "سیپٹک" ہو جانے کی دھمکی دے کر روک رہی ہیں؟"

ایک مہین سی آواز آئی:۔

"ناچیز کو آلپن کہتے ہیں۔"

میں نے منہ سے ہاتھ نکال کر دیکھا۔ خدا کی شان کہ ننھی منی سی آلپن میری دونوں انگلیوں میں دبی پٹر پٹر مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا منہ چمک رہا تھا۔ میں نے بڑی حیرانی سے پوچھا:۔

"اے ننھی منی آلپن کیا تم بول بھی سکتی ہو؟"

آلپن نے کہا۔

"خدا کی مہربانی ہے!"

میں نے اخلاقاً پوچھا۔

"بی آلپن! کیا میرے دانت کریدنے سے تم کو کوئی تکلیف پہنچی؟"

آلپن بولی:۔

"تکلیف کی بھی ایک ہی کہی، آپ مجھے چبائے ڈال رہے ہیں اور اوپر سے پوچھتے ہیں کہ تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے۔"

میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے منھ سے آلپن پھر باہر نکال لی اور پوچھا۔

"مگر آخر تم اتنی ڈر کیوں گئیں میرے خلال کرنے سے؟"

آلپن نے کہا:۔

"ڈرنے کی بات بھی تھی۔ آپ خلال کرنے کے بعد دانتوں سے مجھے مروڑتے اس کے بعد بے کار سمجھ کر زمین پر پھینک دیتے۔ پھر میں کس کام کی رہ جاتی؟"

میں نے پوچھا،

"آلپن، کیا تم اپنے آپ کو بہت ہی کار آمد سمجھتی ہو؟"

آلپن نے کہا،

"قطعی ــ!" اس کے بعد بولی۔

"یاد رکھیے جناب عالی! اس کائنات میں خداوند تعالیٰ نے کوئی بھی چیز بے کار نہیں بنائی۔ مجھے ہی لیجیے! ہوں تو میں آپ کی نظروں میں ایک چھوٹی سی آلپن مگر کتنے بڑے بڑے کام کرتی ہوں، کتنوں کے کام آتی ہوں۔ اگر میں نہ ہوتی تو آپ کے یہ سب سرکاری اور غیر سرکاری دفتر، کاروبار اور ادارے پتا بھی نہ لگا سکتے کہ ان کی فائلوں کے کاغذ کدھر گئے؟ بینکوں میں حساب نہ رہ پاتا کہ کون چیک کس کا ہے؟ اور کس ہنڈی کے کاغذات کہاں ہیں؟"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مانتا ہوں آلپن!"

آلپین نے کہا۔

"یہ بھی نہ بھولیے جناب کہ اس دنیا کا ہر رشتہ ایک چھوٹی سی آلپین سے بندھا ہوا ہے۔ چاہے لاٹری کا لاکھوں روپے کا انعام ہو، یا قتل کے ملزم کے لیے پھانسی کا فیصلہ۔ فوج کو دشمن پر حملے کا حکم ہو یا پروانۂ تقرری۔ غرض اس دنیا کی ہر خوشی و غم کی تقدیر ایک چھوٹی سی آلپین کے سرے سے ٹنکی ہے۔"

میں بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ آلپین کی باتیں سُن رہا تھا۔

آلپین نے کہا۔

"آپ گلاب کا پھول اپنے کوٹ پر لگائیں یا بازو پر سیاہ پٹی کہیں محبت نامہ بھیجیں یا کاروباری خط، آپ کے ہر کاروبار میں یہ ناچیز ہمیشہ آپ کے کام آتی ہے۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ میری ان بے پایاں خدمات کا بلا کوئی خیال کیے اور اس کی خبر لیے کہ آپ کی خدمت کرتے کرتے میرے زنگ تک لگ جاتا ہے، مگر پھر بھی میں آپ ہی کے کام میں اٹکی رہتی ہوں، اس پر بھی آپ مجھے دانتوں سے چباتے ہیں، توڑتے مروڑتے ہیں اور پھر بلا کسی قصور اور سبب کے اپنے بے خیال قدموں تلے روندتے ہیں۔ جن سے میرا رواں رواں دُکھنے لگتا ہے اور میری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ہے۔"

اس نے رحم طلب نظروں سے میری جانب دیکھا اور کہا:

"آپ تو آخر اخبار والے ہیں۔ اگر آپ ہمارا خیال نہ کریں گے تو پھر اس دنیا میں کون ہمارا خیال رکھے گا؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس دنیا میں آج تک کوئی اخبار بلا میری مدد کے نہ نکل سکا۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ اس دنیا کی عظیم ترین صحافی آلپین ہے۔ خاص طور پر چھوٹے موٹے اخبار رسالے، جن کا پیٹ بھرنے کے لیے ہمیشہ آلپین ہی کام آتی ہے۔ اگر آلپین بڑے اخباروں اور رسالوں سے "کٹنگ" نہ کرے تو چھوٹے اخبار اور رسالے نکل تک نہیں سکتے۔ ایک بھی "ڈائجسٹ" نہیں نکل سکتا۔ پھر بھی صحافی ہونے کے رشتے تک سے، آپ میرا

خیال نہیں کرتے۔"

آلپن نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا

"ہم انسان کی خدمت کرتے ہیں جس کے بدلے وہ ہماری جان لے لیتا ہے۔ یہی آدمی کا انصاف ہے؟"

یہ کہہ کر آلپن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میں نے آلپن کا سر، اپنی چھنگلیا سے سہلاتے ہوئے اس کو تسلی دی اور وعدہ کیا کہ "اب آئندہ کبھی کسی بھی آلپن کو کوئی دکھ نہیں دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے آلپن کو تھپتھپانا چاہا۔ میں چونک اٹھا۔ دراصل کھانے کے بعد آلپن سے خلال کرتے میں اونگھ گیا تھا۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ آلپن میرے چبھ گئی تھی۔

کُرسی

کرسی پہلے وجود میں آئی یا آدمی، یہ کوئی کرسی ہی بتا سکتی ہے۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہر تقدیر کے ساتھ ایک کرسی یا اس کی حسرت جڑی ہوتی ہے۔

اس عالم آب و گل میں سب سے پہلے جس کرسی کا حضرت انسان کو شرف حاصل ہوتا ہے، وہ زچہ خانے کا اسٹریچر ہوتا ہے: جو کرسی کم اور چارپائی زیادہ ہوتی ہے۔ اس پر بیٹھنے کی سعادت یوں ممکن نہیں کہ نومولود میں بیٹھنے کا دم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد زندگی بھر اس کا سابقہ چارپائی سے رہتا ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ چارپائی زندگی بھر اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ آخر اسی چارپائی پر اسے عالم فانی سے عالم جاودانی کے سفر پر روانہ کر دیا جاتا ہے۔ چارپائی سے کرسی کا کام زندگی میں انھی دو مواقع پر حضرت انسان کے لیے دوسرے لیتے ہیں۔ خوش آمدید اور الوداع۔ باقی کام زندگی بھر وہ خود چارپائی سے لیتا رہتا ہے۔

دراصل سب سے پہلی کرسی جس پر بیٹھنے کا آدمی کو موقع ملتا ہے، وہ بابا چیئر کہلاتی ہے، جو حصول کرسی کی ابتدائی مشق ہے۔ اس کے بعد اسے جس کرسی پر بٹھایا جاتا ہے، وہ کموڈ ہوتا ہے۔ انحصاری کا یہ پہلا قدم ہے۔ تمنا کے دوسرے قدم کے ساتھ، زندگی بھر انسان ایک کرسی سے دوسری کرسی تک پہنچنے کے لیے بھاگتا رہتا ہے۔

کرسی اور انسان میں اس لیے چولی دامن کا ساتھ ہے کہ کرسی میں چار پائے ہوتے ہیں۔ انسان بھی چوپایہ ہے۔ اس مماثلت کی وجہ سے انسان کی بہت سی فضیلتیں کرسی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آدمی تنگ دل سے سنگ دل تک ہو جاتا ہے، جبکہ کرسی کے، سرے سے دل ہی نہیں ہوتا۔ انسان میں وفا کا بھی مادّہ ہے، لیکن کرسی اس کوچے سے آشنا تک نہیں۔

کرسیاں بھانت بھانت کی ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے متاثر کن کرسی حجام کی ہوتی ہے۔ یہ بالکل لائبریرین کی کرسی کی طرح بلند و بالا ہوتی ہے جس تک پہنچنے کے لیے انتظار یہ کرسی پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ حجام کی کرسی بڑی شان دار ہوتی ہے۔ بالکل کسی راجہ مہاراجہ کی کرسی کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے، جس پر شان سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہی حجام کی ڈبل قینچی چلنے لگتی ہے۔ ایک اُس کے ہاتھ کی، دوسری زبان کی۔ اس کرسی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حجامت کے ساتھ ساتھ آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہوتا رہتا ہے۔ زمانے نے آپ کے ساتھ جو بھی سلوک کیا ہو، یا اس وقت آپ پر جو بھی گزر رہی ہو۔ اس پر آپ حجام کے آئینے میں مسکرا بھی سکتے ہیں۔

حجامت کے بعد رہی سہی کسر ڈاکٹر کے یہاں نکل جاتی ہے۔ سب سے اہم کرسی وہ ہوتی ہے، جو ڈاکٹر کے سامنے رکھی ہوتی ہے۔ یہ فاصلہ مریضوں اور تیمار داروں کو درمیانی کرسیوں کی مدد سے کھسک کھسک کر طے کرنا ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر کی کرسی کسی کو زندہ اٹھا دے تو اسے وکیل کی کرسی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ دانو پیچ کی کرسی ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ اسی لیے اونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ کسی بھی کچہری میں کسی درخت یا ٹین کے سائے میں یہ زمانے کا چھرا اٹھائے رہتی ہے۔ ایسی کرسی پھر شاید یتیم خانے ہی میں نظر آئے۔ جس پر تعجب اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ یتیم خانے اور یتیم زیادہ تر وکیل ہی بناتے ہیں۔ اس کرسی پر

زمانے کے ان جنّات کا ستایا ہوا موکّل بھی بیٹھ سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ وکیل سے ہارے کو پھانسی کی کرسی پر ہی پناہ ملتی ہے۔

پھانسی کی کرسی آٹومیٹک ہوتی ہے۔ ایک ہی جھٹکے میں اپنے نشیں کو بار لگا دیتی ہے۔ یہ اتنی شان دار ہوتی ہے کہ پھر گورکن کو کسی کرسی کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کرسی تو وہ اس پر بھی استعمال کرتا مگر ابھی ہمارے یہاں گورکن کی کرسی ایجاد نہیں ہوئی۔ یورپی گورکن مردے کو ٹھکانے لگانے تک میں کرسی کا استعمال کر لیتے ہیں، لیکن کرسی برآمد نہیں کرتے۔ غیر ملکی مبادلۂ زر کی اگر کمی نہ ہوتی تو یہاں بھی بذریعہ کرسی تدفین کی صورت پیدا ہو چکی ہوتی۔

دنیا میں شور گورکن کا نہیں افسر کی کرسی کا ہے۔ افسری والی کرسی تک آدمی گھسٹ گھسٹ کر پہنچتا ہے۔ لیکن اگر آدمی خاندانی ہے تو اس پر کود کر یا چھین کر بھی بیٹھ سکتا ہے۔ ایگزیکٹو چیئر افسر کے عہدے اور سائز کے مطابق ہوتی ہے۔ ہوم سکریٹری اور تھانیدار کی کرسی میں وہی فرق ہوتا ہے، جو شیر اور بلّی میں ہے۔ چوہوں کے لیے بلّی بھی شیر ہے مگر شیر تو شیر کے لیے بھی شیر ہی ہوتا ہے۔ بڑے افسروں کی کرسیوں کا بھی کوئی نہیں، پھر بھی اُن تک پہنچ جانے کا قیامت کی طرح یقین ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بہت بڑے افسر کے مرنے کی خبر سُن کر ایک بہت چھوٹا افسر مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ اور بولا:

"خدا کا شکر ہے کہ سینیارٹی میں اب میرا نمبر پندرہ ہزار سات سو چالیس سے ایک دم گھٹ کر پندرہ ہزار سات سو انتالیس رہ گیا!"

انتہائی غیر محفوظ کرسیاں وزیروں کی ہوتی ہیں۔ بالکل دندان ساز اور کھٹمل والی کرسی کی طرح۔ دندان ساز کی کرسی پر بیٹھنے کا مطلب ہی بتیسی سے ہاتھ دھو لینا ہوتا ہے۔ یہ کارروائی قسطوں میں بھی ممکن ہے۔ اس کرسی پر انسان تھر تھر کانپتا ہوا بیٹھتا ہے۔ اور بے ہوش ہونے کے بعد اٹھا لیا جاتا ہے، کبھی کرسی سے کبھی دنیا سے ہم نے پھانسی کی کرسی تک پہ اکثر مسکراتے دیکھا ہے۔ مگر اس کا تو تجربہ ہے کہ بیٹھ

والے سے روتے بھی نہیں بنتی، نہ کسی کل چین پڑتا ہے۔

اصلی بے چینی اس کرسی پہ بیٹھنے والے کو ہوتی ہے، جس میں کھٹمل ہوتے ہیں۔ جس طرح جوئیں ہونے کی وجہ سے آدمی کھجاتا ہی رہتا ہے، اسی طرح کھٹملوں کی وجہ سے آدمی بیٹھتا کم، کھجاتا زیادہ ہے، کھجانے سے زیادہ اچھل کود کرتا ہے۔ اگر آپ کو کرسی کی خوبی کا علم نہ ہو تو اس پر بیٹھنے والے پہ آپ کو سرکس کے جوکر کا شبہ ہو جائے۔ سرکس میں ایسے ہی لوگ، باآسانی کھپتے ہیں، کیونکہ بیٹھنا نہ ان کی قسمت میں ہوتا ہے نہ ان کی۔

یہی حال بے چارے وزیروں کا رہتا ہے۔ یہ کرسی پر بیٹھتے ہی اس کو بچانے کے لیے برابر دوڑتے رہتے ہیں، جسے وزارتی اصطلاح میں دورہ کرنا کہتے ہیں۔ وزیر کو اس پر بیٹھنے کا شرف بہت ہی کم حاصل ہوتا ہے، یہاں تک کہ کوئی اور وزیر ہو جاتا ہے، اس پر بھی وزارتی دورے پڑنے لگتے ہیں۔ وزارتی کرسیوں کا بندوبست ووٹ یا بندوق سے ہوتا ہے، یا پھر دل بدلی سے۔

کچھ کرسیاں جیتے جی نہیں چھوڑی جا سکتیں۔ جیسے کسی بھی سربراہِ مملکت کی کرسی۔ ایسا کرسی نشین اگر دورانِ حکومت دنیا سے گزر جائے تو تجربہ ہے کہ لوگ اسے مرنے والے کی عین خوش قسمتی سمجھتے ہیں، کہ نہ اقتدار سے محروم ہونا پڑا، نہ جلاوطنی کا منھ دیکھنا پڑا، نہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ اس کرسی سے ایسا چمٹا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی آسانی سے نہیں چھڑایا جا سکتا۔ کیونکہ کرسی چھوڑنا کوئی نہیں، بچھڑا کر الگ کر دیا جائے تو بات دیگر ہے۔ اس کرسی کو آپ کرسیوں کا صحیح معنوں میں بادشاہ کہہ سکتے ہیں۔ انتہائی شان دار، سونے چاندی کی جڑاؤ پیچ دار، تاکہ قد، وزن اور پھیلاؤ کے حساب سے سما سکے۔ مگر توبہ کیجیے، جو پورے ملک میں نہ سما سکے وہ ایک کرسی میں بھلا کیا آ سکتا ہے۔ یہ کرسی دراصل بوڑھے لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ جو اس تک پہنچنے کے پھیر میں بوڑھے ضرور ہو چلے ہوتے ہیں، مگر طاقت کا نشہ انھیں نوجوانوں سے زیادہ سرگرم رکھتا ہے۔

کرسی چاہے ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی ہو یا ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کی، ساری بھیڑ بھاڑ اور رونق کرسی کے گرد رہتی ہے۔ نہ کہ اس پر بیٹھنے والے کے ارد گرد۔ کرسی وہی رہتی ہے، بھیڑ وہی ہوتی ہے، بس بیٹھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ ہر ہیڈ کی کرسی پر بیٹھنے والے کو خواب میں بھی اس کا تصور نہیں ہوتا کہ ایک دن یہ کرسی اسے بھی ریٹائر کر دے گی۔ اور یہ حال کر دے گی کہ ؏

کرسی نہیں تو کوڑی کا تین تین ہے

چنانچہ محروم کرسی کے گرد ایسا سناٹا چھا جاتا ہے کہ وہ زندہ بدست مردہ، قبر کی کرسی کی آرزو کرنے لگتا ہے جس کا پورا کرنا نہ کرنا عرش کی کرسی کے اختیار میں ہے۔ سائنس، سیاست اور حکمت کی بے پناہ ترقی تک، اس اختیار میں اب تک کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکی ہے۔

چیونٹی

ہاتھی کو دیکھ کر بڑے بڑوں کو جھُرجھُری آجاتی ہے۔اس کے تیور دیکھ کر تو رستم کا کلیجہ رکھنے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔لیکن خود ہاتھی اس دنیا میں اگر کسی چیز سے ڈرتا ہے تو چیونٹی سے حقیر چیونٹی ننھی سی جان پھونک مارو تو اڑ جائے۔یہی کمترین چیونٹی اگر ہاتھی کے کاٹ لے تو یہ ہیل تن تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔جب ہاتھی اللہ کو پیارا ہوتا ہے تو اس کی آخری رسوم کی ادائیگی بھی یہی چونٹیاں انجام دیتی ہیں۔اس کا سارا گوشت پوست ان کے ننھے منے معدوں میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ڈھانچہ حضرتِ انسان اٹھالے جاتے ہیں۔ اور ہاتھی دانت کے نام پر اس کی ایک ایک ہڈی سے زیور، آرائش، میز، کرسی، صوفے، سنگاردان، قلم، بٹن، چاقو، چھریوں کے دستے، حاضری کے گھنٹے اور نہ جانے کیا کیا مصنوعات تیار کر کے بازار میں دام کھرے کر لیتے ہیں۔

ایک کھا کر پیٹ بھرتی ہے۔دوسرا بیچ کر پیٹ پالتا ہے۔غرض ہاتھی کو نہ آدمی چھوڑتا ہے نہ چیونٹی۔انسان ہاتھی کی پیدائش سے موت تک ہر ہر قدم پر اسے اپنی پرورش کا وسیلہ بناتا ہے۔خواہ اسے سرکس میں پیش کرے، فاتح بن کر اس پر جلوس کرے، بارات کا دولھا بن کر نکلے، امارت وشکوہ کے مظاہرے کرے، گاڑی میں جوت کر شہتیر ڈھوئے یا اس کی ہڈیاں بیچے۔

ہاتھی زندگی بھر چیونٹی سے بھاگتا ہے۔لیکن آخر میں اس کا لقمۂ تر بن جاتا ہے۔شاید ہاتھی اور چیونٹی کے لیے ہی ہر فرعون را موسیٰ کہا گیا ہے۔چیونٹی تو شیر تک کو نہیں بخشتی۔اس فرعون کا بھی انجام چیونٹی کے ہاتھوں تمام ہوتا ہے۔

چیونٹی کے سلیقے، قرینے، چلنے کی ادا، تنظیم و ترتیب سے میں متاثر اور اس کی یلغار سے ہراساں رہتا ہوں۔

جب بھی چیونٹیوں کی فوجِ ظفر موج کو کوچ کرتے دیکھتا ہوں تو "مورِ سلیمان" کا واقعہ بے اختیار یاد آجاتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کا لشکر آتے دیکھ کر چیونٹیوں کے سردار نیملا نے پکار کر کہا تھا۔

"چیونٹیوں سب اپنے اپنے سوراخوں میں چلی جاؤ۔"

— حضرت سلیمان نے یہ بات سن لی اور نیملا کو اپنی ہتھیلی پر اٹھا کر فرمایا۔

"تم نے یہ کیوں کہا تھا؟"

چیونٹیوں کے سردار نے عرض کیا۔

"اس لیے کہ میری قوم آپ کے لشکر کے قدموں تلے نہ پس جائے۔"

"کیا تم کو نہیں معلوم کہ خدا نے ہم کو اور تم کو پیدا کیا ہے؟"

"معلوم ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی حفاظت آپ کرنا بھی خدا ہی نے بتایا ہے"

حضرت سلیمان اس جواب سے بے حد خوش ہوئے۔ چیونٹی کے سلیقے اور نظم و ضبط سے انسان کیا، نبی تک خوش ہوئے۔

بچپن میں ہر لڑکے کو چیونٹی کے بارے میں اس لیے بتایا اور پڑھایا جاتا ہے کہ وہ ان کی زندگی سے سبق حاصل کر کے اپنے آپ کو منظم کر سکے۔ بچپن میں مولوی صاحب۔ "مورِ سلیمان" کا واقعہ اسی سلسلے میں بتاتے۔

مجھے اس وقت بے اختیار وہ قول یاد آرہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

"زندگی سے موت تک چیونٹیوں سے نجات انسان کے بس کی بات نہیں۔"

آپ سے بھی کیا چوری، یہ میرا ہی قول ہے، جو اس وقت ادا کیا گیا تھا، جب چیونٹیاں میری شیونگ کریم صاف کر گئیں تھیں۔ بھلا شیونگ کریم سے چیونٹی کا کیا واسطہ؟ کون سی اسے داڑھی مونچھ بنانی تھی۔ مگر وقت کی مکڑی کی طرح، اسے تو ہر چیز اپنے جالے میں لپیٹ کر چٹ کر جانے سے مطلب۔

ایک بار مجھے ایک شریر چیونٹی پر بڑا غصہ آیا۔ وہ زمین یا دیوار کے کسی سوراخ میں رسد پہنچانے والی لائن میں لگنے، سامانِ خورونوش کے سراغ میں گرے پڑے دانے دُنکے کو دیکھ کر لائن میں بے تحاشا دوڑنے کے بجائے، میری آنکھ اور عینک کے درمیان گردش میں تھی۔ نہ میں اسے مار سکتا تھا، نہ اس کے خلاف ایسے نازک موقع پر کوئی کارروائی کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ چشمہ کے فریم پر آئی میں نے جھٹ اُتار کر، میز پر رکھ دی۔ جیسے ہی وہ میز پر رینگی میں نے انتقاماً گلاس اُلٹ کر اُس پر رکھ دیا۔ چیونٹی گلاس کے گرد اسی طرح چکر لگا رہی تھی، جیسے میلے یا نمائش میں، "موت کے کنوئیں" میں موٹر سائیکل سوار چکر لگاتا ہے۔ آخر گلاس کی دیوار پر اسے کھانے پینے کی کوئی چیز مل گئی۔ جس کو اس نے اپنے منھ میں دبا لیا اور احتیاط سے نیچے اترنے لگی، تھوڑی دیر میں چیونٹی غائب ہو گئی۔ میں نے بہت ڈھونڈا مگر وہ گلاس کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ تھک کر جیسے ہی بیٹھا، اچانک بازو پہ نظر پڑی۔ چیونٹی بے اختیار میری عینک کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں نے عینک اتار لی۔ وہ بھی نیچے اُترنے لگی۔ عینک کے ایک خاص مقام پہ پہنچ کر وہ رُک گئی۔

دراصل صبح ناشتے میں شہد چاٹتے میں عینک سنبھالی تھی۔ شہد عینک پہ لگ گیا تھا۔ میں نے عینک کپڑے سے پونچھ کر رکھ دی۔ چیونٹی پھر اس جگہ تک گئی اور فوراً ہی واپس ہو گئی۔ میں نے اطمینان سے عینک لگاتے ہوئے سوچا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس کو میرے معدے میں جانے والے شہد کی خوشبو نہیں لگی، ورنہ بجائے عینک کے لاتعداد چیونٹیاں میرے پیٹ میں اس وقت دوڑ رہی ہوتیں۔

جب بھی چیونٹی کو کام کرتے دیکھنے کا اطمینان سے موقعہ ملتا ہے تو میری یہ رائے اور پختہ ہو جاتی ہے کہ تمام مخلوق میں چیونٹی سب سے زیادہ صناع، جفاکش اور مستقبل مزاج ہے۔ چرندوں اور پرندوں کی عقل تو اس کے آگے مات۔

برسات تک میں کوئی چیونٹی میں نے خالی نہیں دیکھی۔ خیر برسات میں تو اس کے پر نکلتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی سرگرمیاں زمین سے آسمان تک پہنچ جاتی ہیں۔ میری مراد عام چیونٹیوں سے ہے نہ کہ یورپ، امریکا یا ایشیا کی وہ حیرت انگیز چیونٹیاں جو ووٹ دیتیں، فوجیں تیار کرتیں، امن کے نام پر لڑتیں، مذہب کے نام پہ لڑاتیں، غلام بناتیں، ہر قسم کے کالے دھندے کرتیں، بدعنوانی، کنبہ پروری، علاقائیت اور ہر قسم کی عصبیت کو فروغ دیتی ہیں۔

چیونٹی سدا چلتی رہتی ہے۔ شکار کی تلاش میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر، وہ دیکھیے اپنے قد اور وزن سے کئی گنا زیادہ بڑے ٹڈے کو پیٹھ پر اُٹھائے اپنے گھر کے مخالف سمت بھاگی چلی جا رہی ہے۔ کسی پتھر یا پودے سے کترا کر نکل جانا اس کی شان کے خلاف ہوگا۔ شکار کو منہ میں دبائے، پتھر یا پودے کے اوپر چڑھ کر دیکھے گی کہ کوئی خطرہ تو آگے نہیں؟ پھر اُتر کر نامعلوم منزل کی جانب دوڑنے لگے گی۔ یہ ایسا ہی مشکل کام ہوگا جیسا کہ سر پر آٹے کی بوری لاد کر آپ کو کاٹھ گودام سے نینی تال، یا دہرہ دون سے مسوری دوڑا دیا جائے۔ اس طرح چند گز کے اندر چند انچ کا فاصلہ کئی گھنٹہ میں طے کرنے کے بعد بھی نشیب و فراز کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ تازہ دم ہو، گرد جھاڑ، اس اطمینان سے کہ یہ راستہ گھر کو تو نہیں جاتا، پھر دوڑنے لگے گی۔ یہاں تک کہ کسی دوسری چیونٹی کے اچانک آ جانے پر رُک جائے گی۔ سہیلی للچائی ہوئی نظروں سے شکار کو دیکھتی ہوئی تعریف کرے گی۔

"وہ پچھلا ٹڈا جو تم لائی تھیں، اس کے سری پائے بے حد لذیذ تھے۔ کہاں مل گیا تھا؟"

پچھلی باتیں بھلا کہاں یاد آنے لگیں، کام کے لوگ ماضی نہیں حال میں جیتے ہیں۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاہدے کے بعد دونوں شکار کی ٹانگیں پکڑ کر مخالف سمت میں دوڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ناکامی کے بعد پھر جائزہ لیا جاتا ہے کہ آخر گڑبڑ کیا ہے؟ پھر روانہ ہوئیں، رُکتیں، مشترکہ معائنہ کرتیں اور

اختلاف رائے کی صورت میں لڑتیں، زخمی ہونے پر ٹھنڈک ہو جاتی، زخمی بڈے کی ٹانگ لٹک جاتی، کھینچا تانی میں آگے بڑھنا ناممکن ہو جاتا۔ ٹانگیں الگ ہو جاتیں، ہائے کھانے کی جلدی میں معاہدے کی پرواہ کیے بغیر، وہ ٹانگیں لے کر بھاگ جاتی، چیونٹی اپنے آپ کو وہیں پاتی، جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ نیم جاں بڈا جو پورے طور پر مرا تک نہ تھا اور اس دُرگت پہ اچھا خاصا مزاحمت کر رہا تھا، ٹانگیں کم ہو جانے کی وجہ سے اس کا لے جانا کچھ آسان ہو گیا۔ اس کے حلق میں پنجے گاڑے، ہوا میں اُٹھائے تیزی سے دوڑنے لگی۔ اور ایک درخت کی جڑ میں پہنچ کر غائب ہو گئی۔ جس میں سے نکلتی ہوئی چیونٹیوں کی قطار اس بات کی گواہ تھی کہ یہی اس کا گھر ہے۔

آج چیونٹیوں پہ میری بہت نگاہ دوڑ رہی ہے۔ پھر میں نے چیونٹیوں کی ایک فوج دیکھی جو ایک مُردہ چھپکلی لیے جا رہی ہیں۔ جس طرح جنازہ کر بن سے اٹھایا جاتا ہے، اسی طرح وہ چھپکلی کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس چھپکلی کو جو انھیں زندگی بھر کھاتی رہی۔ آج وہ اس کی دعوت اڑائیں گی۔ دراصل چیونٹیوں کی اس یلغار نے ہی مجھے ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ڈھل مُل بھائی

ڈھل مُل بھائی، بالکل ڈھل مل یقین ہیں۔ جب وہ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے تو انھوں نے دسویں درجہ کے امتحان کی بڑے زوروں سے تیاری کی۔ سب کو پکا یقین تھا کہ ضرور فرسٹ آئیں گے۔ لیکن جب امتحان دینے گئے تو کہیں نظر نہیں آئے۔ امتحان دے کر ان کے یہاں پہنچا تو دیکھا بے خبر سو رہے ہیں۔ جگایا تو بڑی مشکل سے اٹھے۔ امتحان کے بارے میں پوچھا تو بولے: امتحان دینے سے فائدہ؟ آرٹس میں رکھا کیا ہے؟ یہ دنیا اور زمانہ سائنس کا ہے۔ سمجھ لو آج تک میں نے جو کچھ پڑھا وہ گدھے پر لاد دیا۔ اب میں پوری تیاری کر کے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دوں گا!"

یہ سن کر ہم نے سر پیٹ لیا۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح جمے رہے اور برابر ثابت کرتے رہے کہ مجھے ڈاکٹر یا انجینیر بننا ہے اس لیے سائنس میرے لیے اتنی ہی ضروری ہے، جتنا آدمی کو زندہ رکھنے کے لیے پانی اور ہوا۔

چونکہ مجھے اگلے پرچے کی تیاری کرنا تھی۔ اس لیے انھیں ہوا کھاتا چھوڑ کر چلا آیا۔

انھوں نے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دیا اور فرسٹ آئے۔ اب ہم کو بالکل یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ڈھل مل بھائی ڈاکٹر، انجینیر یا سائنس داں بن کر اپنی قابلیت کی دھوم مچا دیں گے۔ لیکن جب ہم

کالج پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ وہ داخلہ کا فارم لیے دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں۔ اور کامرس میں نام لکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کچھ پوچھنے کا موقع نہ دیتے ہوئے بولے۔ "یہ عہد بھائی صاحب تجارت کا ہے۔ آج کل بزنس میں بڑی ترقی ہے۔ اس لیے میں کامرس پڑھوں گا۔" چونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ حضرت بلا کے اڑیل ہیں، اس لیے ہماری ہمت، انھیں کامرس پڑھ کر، ترقی سے روکنے کی نہ ہوئی۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے کام پورا کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن ہمیں یہ بتانے آئے کہ "میرا ارادہ اب وکالت کا یا بیرسٹری کا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ تو بزنس میں دلچسپی رکھتے تھے؟" بولے "دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا بزنس مین بھی وکیلوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ جب وکالت ہی کرنا ہے تو بی کام سے فائدہ؟ کیوں نہ بی۔اے کریں۔ ایک تو بی کام میں کوئی سوشل لائف نہیں، دوسرے بی کام کریں، پھر ایم کام کریں، پھر کہیں سے پچاس ہزار روپیہ لا کر لگائیں تو بزنس شروع ہو۔ پھر اس میں بھی آپ جانیے، ہزاروں خطرے۔ بے پناہ کمپٹیشن چلی چلی، نہ چلی دیوالیہ ہونے کی صورت میں سوائے خودکشی کے چارہ نہیں۔ اس لیے بس بی۔اے کریں، ایل ایل بی کریں اور کھٹ سے وکالت چمکالیں۔" ہم نے عادتاً ہاں میں ہاں ملائی اور کلاس میں واپس چلے گئے۔ بی اے کا امتحان شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ڈھل مل بھائی نے امتحان سے ڈراپ کرنے کا اعلان کر دیا ہے ہم نے وجہ پوچھی تو بولے "حاضری کم ہے اس لیے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ مل سکے گی۔" ہم نے پوچھا "کتنی کم ہے؟" بولے "سینٹ پرسنٹ" ہم نے کہا۔ "کیا آپ ایک دن بھی کلاس میں تشریف نہیں لے گئے؟" بولے "سوشل اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ یونی ورسٹی تو پابندی سے ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا مگر یار دوست جلسے، جلوس، پارٹی پالیٹکس اور کینٹین کی بیٹھک بازی میں ایسا لگ جاتا کہ کلاس تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی۔" یہ سن کر ہم خاموش ہو گئے۔

پھر ہم نے سنا کہ وہ پرائیویٹ امتحان دے رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

ایک دن ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ پڑھائی میں غرق ہیں۔ بڑے بے رُخی سے بولے "امتحان بعد آئیے گا۔" اس کے بعد انھوں نے پھر رٹائی شروع کر دی۔ مجبوراً ہم اٹھ کر چلے آئے۔

کچھ دن بعد نتیجہ نکلا وہ پھر فرسٹ آ گئے۔ مبارک باد دینے گئے۔ باتوں باتوں میں پوچھا۔ "شاید اب آپ ایل ایل بی جوائن کریں؟" بولے "وکالت میں کیا دھرا ہے؟ اب میرا ارادہ کھیتی کرنے کا ہو رہا ہے۔ کھیتی، جس کے لیے کہا گیا ہے۔

اُتم کھیتی، مدھم بان

نکھد چاکری، بھیک ندان

ڈھل مل بھائی نے کھیتی کے لیے زمین کا انتظام کیا، ابھی وہ زمین جوتنے کے انتظامات مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ایک رات اچانک آ گئے اور مجھے سوتے سے جگا کر مارے خوشی کے خود بخود اچھل پڑے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟" بولے۔ "خزانہ مل گیا۔ خزانہ!" خزانے کا نام سن کر میرے دونوں کان کھڑے ہو گئے۔ ایک دم سوالیہ نشان بن کر پوچھا "کیا کھیت جوتنے میں کچھ نکل آیا؟" بولے "کھیت؟ ادھو، اماں تم بھی مہا بھارت سے پہلے کی باتیں کر رہے ہو۔ کھیتی ویتی سب بیکار۔ اب میں مچھلیاں پالوں گا مچھلیاں اور چند دن میں لکھ پتی ہو جاؤں گا۔ تم سے موٹر پہ ملنے آیا کروں گا۔ سمجھے موٹر پہ" پھر خود ہی جھک کر بولے۔ "اس وقت جلدی میں ہوں۔ کسی دن میرے تال پر آؤ۔ عالم باغ میں بالکل لب سڑک ہے۔ بس اسٹینڈ کے سامنے والی کالج میں مل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئے اور ہم سو گئے۔

کئی دن بعد ہمیں بھی ڈھل مل بھائی کا خزانہ دیکھنے میں شوق چرّایا۔ بس سے

عالم باغ پہنچے۔ دیکھا وہ کاٹج میں لنگوٹ باندھے جھاڑو لیے صفائی میں مصروف تھے۔ اِن کے چاروں طرف مرغوں کے ٹاپے، ڈربے، اور جالیاں تھیں، جن سے کُٹ کُٹ کٹاک، ککڑوں کوں اور چوں چوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم نے انھیں اس حلیے میں دیکھ کر پوچھا، "آپ کا خزانہ اور موٹر کہاں ہے اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟" ہنس کر بولے "اب یہی میرا خزانہ ہے۔ اسی میں سے موٹر برآمد ہوگی۔ مچھلیوں کے کاروبار میں سب سے بڑا خطرہ مچھلیوں کے مرجانے کا ہوتا ہے پھر اس میں تو ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔" انھوں نے چلتے وقت ایک درجن انڈے بھی ہمارے ساتھ کردیے اور گھر آنے کا وعدہ بھی لے لیا۔ دوسرے دن ہم ان کے گھر گئے تو دیکھا کہ مکان پر انھوں نے سفید ے اور تار کول سے خوشنما حروف میں "مرغ ہاؤس" لکھوا رکھا ہے۔ جس کے دونوں طرف بطور ٹریڈ مارک دو اصیل مُرغ اپنی چھب دکھا رہے ہیں۔ ڈھل مل بھائی ہم سے بہت دیر تک یورپ اور امریکہ میں مرغبانی کے جدید ترین رجحانات پر بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم چلے آئے۔

کچھ دن بعد ہم اُن کے پولٹری فارم پر گئے تو ایک اینگلو انڈین صاحب بیٹھے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ "ڈھل مل بھائی نے فارم اِن کے ہاتھ بیچ دیا۔ اب ڈھل مل بھائی اِدھر نہیں آتا۔" یہ سن کر ہم جلے بھنے ان کے گھر پہنچے اور ان سے پوچھا "یہ جما جمایا کاروبار کیوں ختم کردیا؟" ہنس کر بولے "پولٹری میں کیا رکھا ہے میرے بھائی۔ سائیکل کے دھندے میں بڑا نفع ہے۔ سوچتا ہوں ٹائر ٹیوب کی ایجنسی لے لوں۔ یوں کئی کام ایک ساتھ ذہن میں ہیں۔ بھٹے کے کام میں بھی اندھا نفع ہے۔ اگر آپ کہیں سے سیمنٹ اور لوہا لنگڑا لے آئیں اور آپ کے پاس زمین خالی پڑی ہو، تو مفت میں کوٹھی کھڑی ہو سکتی ہے کیونکہ اینٹ اور مزدور تو بھٹے کے ہوں گے اور نفع گھاتے کا۔" ہم سمجھ گئے کہ اب یہ سائیکل کی ایجنسی اور بھٹے کا کاروبار کئی ہفتے تک کرتے رہیں گے۔

اس وقت تو ہم چلے آئے۔ لیکن دو چار دن بعد انھیں سمجھانے کے لیے جب ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ پورا گھر ورکشاپ ہو رہا ہے ہر طرف سے گھرر گھرر اور کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی ہیں، جا بجا بڑھئی لگے ہوئے تھے، لٹھوں اور تختوں کے چٹے لگے تھے۔ ڈھل مل بھائی کان میں پنسل لگائے نیکر پہنے، ایک تختے پر دونوں ہاتھ رکھے، مستری کو آفس ٹیبل کی نئی ڈیزائن سمجھا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے،

"انسان کو پیدائش سے موت تک ہر قدم پر بڑھئی کی ضرورت، پالنے سے قبر کے تختوں تک پڑتی ہے۔" اس بار انھوں نے ہمیں یقین دلایا کہ "اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ نفع کا کوئی ٹھکانہ نہیں پھر میرا دل پسند کام ہے۔" اور میں اس بات پر زور دیتا رہا کہ "بھائی کم از کم اسی پر توجہ رہیے!"

کچھ دن بعد آفس سے لوٹتے میں ایک صاحب کے ساتھ ایک ریستوراں میں گھسے تو دیکھا کہ ڈھل مل بھائی ہوٹل کے کاؤنٹر پر جمے کیش میمو کاٹ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، خیریت؟" ہنستے ہوئے بولے "آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ بڑھئی خانے سے چائے خانے تک کیسے پہنچے؟ بات بالکل صاف ہے۔ جو نفع اور ٹھاٹھ ہوٹل بزنس میں ہیں، اُن کا وڈ ورکس میں سرے سے سوال نہیں" تھوڑی دیر بیٹھ کر میں گھر چلا آیا۔

کچھ دن بعد میرا شملہ جانا ہوا۔ ہوٹل سے نکل رہا تھا۔ دیکھا سامنے سے ڈھل مل بھائی چلے آ رہے ہیں، سوٹ پہنے، بو لگائے، پائپ کے دھوئیں اڑاتے۔ بڑے تپاک سے ملے اور انگریزی میں خیریت پوچھی، پھر کچھ وقت اکٹھا گزارنے کی درخواست کی۔ ہم لوگ ہوٹل کے لان میں جم گئے۔ کافی کا دور چلا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ ہوٹل کے دھندے میں دھوئیں اور گندگی کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے۔ اس لیے انھوں نے دواؤں کی ایک بہت

بڑی فرم جوائن کرلی۔ اس کے وہ چیف ربر یزنٹیٹو ہیں۔ طے پایا کہ شام کو پھر ملا جائے اور سینما دیکھا جائے، مگر حسبِ عادت وہ وقت پر نہیں آئے۔ مجبوراً اکیلا سینما چلا گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ انھوں نے عین وقت پر فیصلہ کیا کہ "اس وقت سینما دیکھنے سے زیادہ لطف اسکیٹینگ میں آئے گا۔" جب رنگ پر پہنچے تو بلیرڈ کھیلنے میں ایسا محو ہوئے کہ اسکیٹینگ کرنے اور مجھ سے فون پر معذرت کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔

دوسرے دن جب میں ان سے شکایت کرنے گیا تو وہ بیرے سے مشورہ لے رہے تھے کہ "اس وقت کھانا کھایا جائے یا ناشتہ کیا جائے۔؟"

میں نے کہا۔ ناشتے کا وقت ہے، اس لیے میں ناشتہ کروں گا، رہا آپ کا معاملہ، تو ٹاس کر لیجیے۔" لیکن ٹاس سے بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ سکہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے میرے لیے ناشتہ منگایا اور خود نہانے چلے گئے۔ کیونکہ ابھی تک فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ ناشتہ کریں یا کھانا کھائیں۔

کچھ دن بعد میں شملہ سے لوٹ آیا۔ ایک دن حضرت گنج سے گزر رہا تھا۔ دیکھا ڈھل مل بھائی کھڑے ایک عالی شان عمارت نیلام کر رہے ہیں۔ پیشے کے ساتھ ساتھ ان کے حلیے، لباس اور شخصیت میں بھی انقلاب آ چکا تھا۔ مگر مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔ انھوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں ٹھہر گیا۔ نیلام ختم کرنے کے بعد بولے ــــ

"بھائی آپ سے ایک بہت اہم مشورہ کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"فرمائیے ــــ!"

انھوں نے کتّوں کا فارم کھولنے اور اعلیٰ نسل کے پلّے سپلائی کرنے کے کام کے سلسلے میں مجھ سے بہت دیر تک صلاح مشورہ کیا۔ میں نے جل کر کہا۔ "کباڑا در مرٹر کے کام میں بھی بہت نفع ہے۔" جلدی سے بولے۔

"ہاں ہاں! ان دونوں کاموں کے بارے میں، میں بھی بہت دن سے غور کر رہا ہوں۔ مگر فی الحال تو کتوں کا کام نفع بخش نظر آرہا ہے۔"

غرض ڈھل مل بھائی سے جب بھی ہماری ملاقات ہوئی تو وہ ہمیں کسی بالکل نئے کاروبار میں الجھے یا اچھے خاصے کام کو مٹی میں ملاتے نظر آئے۔ وہ، کتوں کے بارے میں مشورہ لے کر گئے اور بکریاں چراتے نظر آئے۔ بکریوں کی توقع میں گئے تو بچہ گاڑیاں بناتے ملے۔ غرض ان کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ کب کون سا کام ختم یا شروع کریں۔

مسٹر گوموٹو سے انٹرویو

موسم، مہنگائی اور معشوق سے بھی زیادہ ہمیں بڑے آدمیوں کی فکر رہتی ہے۔ اخبار نویس جو ٹھہرے۔

بڑا آدمی اس کو کہتے ہیں جو گھیراؤ کے باوجود اخباری نمائندوں کے قابو میں نہ آسکے۔ دن رات لاسہ لگانے کے باوجود صاف نکل جائے اور بالکل ہاتھ نہ آئے۔

انٹرویو کے چکر میں ہمیں نیند کیوں رات بھر نہیں آتی، اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ ایک دفعہ کہیں سے ہم بُو پا گئے کہ ایک عدد بڑا آدمی صحرائے اعظم میں پارس پتھر دریافت کرنے کے بعد پیٹ لینڈ جا رہا ہے، اُس کا اسپیشل بوئنگ جیٹ ۳ بجے رات کو ہوائی اڈے پر پانچ منٹ کے لیے رُکے گا اور مسٹر گوموٹو مو اس میں سے ایک منٹ کے لیے برآمد ہوں گے، تاکہ شہر ان کو دیکھ سکے۔

اب ہمارے لیے ضروری ہوگیا کہ اپنا کھانا پینا اور نیند حرام کر کے ہوائی اڈے پر ڈٹ جائیں۔ چائے، کافی اور گپ کے سہارے جوں توں وقت کاٹنے کے بعد، خدا خدا کر کے رات کے تین بجے معلوم ہوا کہ موسم کی خرابی کے باعث مسٹر گوموٹو مو کا جہاز دو گھنٹہ تاخیر سے یعنی ٹھیک پانچ بجے صبح پہنچے گا۔ چلیے صاحب! رات تو گئی۔ اب ڈر کے مارے منہ پر چھینٹے ملرے جا رہے ہیں کہ اگر اونگھ گئے تو بڑا آدمی صاف نکل جائے گا۔ اگر ہمارے اخبار میں اُن کا

باتصویر بیان شائع نہ ہوا تو غضب ہی ہو جائے گا۔

پانچ بجے صبح جب مسٹر گوموٹومو کا بوئنگ ہوائی اڈے پر ایک جھٹکے کے ساتھ رُکا تو اس میں سے موصوف اس لیے برآمد نہ ہو سکے کہ وہ بے خبر سو رہے تھے اور بوئنگ چھوٹنے میں صرف چند سیکنڈ رہ گئے تو ہمارے چھکے چھوٹ گئے۔ ایک ہائی لینڈر جو اپنے جہاز کے انتظار میں وقت گزاری کے طور پر بوئنگ کے قریب کھڑا تھا، اس کے ہم نے کئی پوز کھینچ لیے اور اطمینان سے گھر آکر سو گئے۔

دوسرے دن ہم نے مسٹر گوموٹومو کی نام نہاد تصویر اور خصوصی انٹرویو اپنے اخبار میں اشاعت کے لیے دے دیا۔

ہمارے اخبار میں گوموٹومو کی تصویر بہت آب و تاب سے شائع ہوئی جسے دیکھ کر دوسرے تمام اخبار والے سر پکڑ رہ گئے۔ اسی کے ساتھ وہ خصوصی انٹرویو بھی تھا جس میں مسٹر گوموٹومو نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی حیرت انگیز دریافت پارس پتھر اُن کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کی انگوٹھی میں جگمگا رہا تھا، انہوں نے ہمارے نمائندۂ خصوصی کے سوالات کے جواب میں بتایا۔

"میں صحرائے اعظم کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے لیے گیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ ریگستان کے شمالی مشرقی منطقہ کا مجھے ٹھیکہ مل جائے گا۔ اور میں اس تپتے ہوئے صحرا کے چمکتے ہوئے ریگ زار کو پارس پتھر کی مدد سے دنیا کی عظیم ترین سونے کی کان میں تبدیل کر دوں گا۔"

جب موصوف نے پارس پتھر کا کمال دکھاتے ہوئے ہمارے نامہ نگار خصوصی کی چاندی کی انگوٹھی سے اپنی انگشتری مس کی تو وہ کندن کی طرح دمکنے لگی۔ اور نامہ نگار دنگ رہ گیا۔ جب ہمارے نامہ نگار نے مسٹر گوموٹومو سے ہاتھ ملانا چاہا تو انھوں نے دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنا پسند کیا اور بتایا کہ وہ داہنے ہاتھ سے شیک ہینڈ کرنے میں خطرہ ہے کہ اگر کہیں پارس پتھر غلطی سے آپ کے جسم سے ٹچ ہو گیا تو آپ یک لخت سونے کے ہو جائیں گے۔

اور مجبوراً مجھے آپ کو اٹھا کر اپنے جہاز کے اسی گوشے میں ڈالنا پڑے گا، جہاں ان تمام اشیا کا انبار ہے جو پارس پتھر چھو جانے کے نتیجے میں سونے کی ہو چکی ہیں۔"

ہمارے نمائندے نے جب مسٹر گوموٹو مو سے پوچھا کہ "پٹی لینڈ سے یہاں تک آپ نے کیا نوش فرمایا؟"

تو انھوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ جواب دیا کہ "جو کھانا میرے ساتھ تھا، وہ میں نے کھانے کے بجائے سونا بنا دیا اور افسوس اس بات کا ہے کہ سونا کھایا نہیں جا سکتا۔ سونے سے بھوکا مارا جا سکتا ہے۔ مگر پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ یہ سونے کی سب سے بڑی خامی ہے۔ لیکن میں برابر تجربہ کر رہا ہوں کہ سونے کو کھانے کے لائق بنایا جا سکے۔"

ہمارے نامہ نگار خصوصی نے بڑے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ "آپ سونے سے دنیا خرید سکتے ہیں۔ زمانے بھر کی نعمتوں کے انبار لگا سکتے ہیں مگر نہ اسے انگور کی طرح چکھ سکتے ہیں اور نہ عطر کی طرح لگا سکتے ہیں؟"

مسٹر گوموٹو مو نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا "میں دنیا بھر کا کھانا سونے سے خرید کر ساری دنیا کو بھوکا مار سکتا ہوں۔ سونے کا اسٹاک کر کے دنیا بھر کے بینکوں کا دیوالہ نکال سکتا ہوں۔ دنیا بھر کے سونے کو بازار میں لا کر سونے کو مٹی میں ملا سکتا۔ مگر افسوس نہ میں اسے پھول کی طرح سونگھ کر مسرور ہو سکتا ہوں نہ اسے عطر کی طرح چھڑک کر اپنا دماغ تر و تازہ کر سکتا ہوں، نہ پڈنگ کی طرح کھا یا سوپ کی طرح پی کر لذتِ کام و دہن حاصل کر سکتا ہوں۔"

ہمارے نمائندے خصوصی نے تعجب سے پوچھا "پھر آپ اتنے بہت سے سونے کا کیا کریں گے؟" ہم لوگ تو سونے کا ذاتی استعمال اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اسے بچا کر ہم اپنی قومی دولت بڑھاتے ہیں۔ اور سونے کو اس لیے سنبھال کر رکھتے ہیں کہ اس سے ہماری ملکی خوش حالی بڑھے گی اور غیر ملکی مبادلۂ زر حاصل ہو سکے گا۔"

مسٹر گوموٹومو نے اسمگلروں والی مخصوص پُراسرار مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں گا؟ میں اس کے ذریعے دنیا پادشاہت کروں گا۔ میں ایک ڈرلڈ گورنمنٹ، میرا مطلب عالمی حکومت قائم کروں گا۔ میں سوشلزم لاؤں گا۔ میں اس کے ذریعے حکومتیں قائم کرا سکتا ہوں، حکومتوں کے تختے پلٹ سکتا ہوں، قیمتوں کو آسمان پر لے جا سکتا ہوں۔ اور پاتال میں پھینک سکتا ہوں۔ دوزخ اور جنت قائم کر سکتا ہوں۔ نسلِ انسانی کے ارتقا کا سُراغ لگا سکتا ہوں۔"

ہمارے نمائندے نے تعجب سے پوچھا۔ نسل انسانی کے ارتقا کا آپ کیسے سُراغ لگا سکتے ہیں؟ میرا مطلب اس کا تو سراغ لگ چکا ہے۔"

انہوں نے سختی کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں! نہیں! میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں خلا پر ایک تحقیقی ادارہ قائم کروں گا، جہاں خلائی سائنس داں ثابت کریں گے کہ انسان آدمی نہیں، گرگٹ کی اولاد ہے۔"

"ہیں کیا کہا؟ گرگٹ کی اولاد ہے؟ یعنی انسان گرگٹ کی اولاد ہے؟"

دیکھیے نا اگر انسان واقعی بندر کی اولاد ہوتا تو پھر وہ گرگٹ کی طرح دم بدم رنگ کیسے بدل سکتا تھا؟ گھڑی میں کچھ گھنٹے میں کچھ۔ دل میں کچھ منھ پہ کچھ، دماغ میں کچھ، ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔"

ہمارے نمائندے نے پوچھا:

"آدمی کو گرگٹ کی اولاد ثابت کرنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ؟ فائدہ بالکل صاف ہے۔ ظاہر ہے۔ انسان کو اپنے جدِ امجد کا پتا چل جائے گا۔ اور وہ اپنے مورثِ اعلیٰ کے نقشِ قدم پر چلنے میں شرمائے گا نہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان کے قول و فعل میں بظاہر جو تضاد ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اسے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا ایک اخلاقی جواز اور ایک اخلاقی بنیاد مل جائے گی۔"

مسٹر گوموٹومو نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ایک نجومی نے ان کو بتایا ہے کہ وہ مریں گے نہیں بلکہ آخر میں خود بھی سونا ہو جائیں گے۔

مسٹر گوموٹومو نے الوداعی سلام کے لیے جب ہوا میں ہاتھ لہرایا تو ہمارے نمائندے خصوصی نے حیرت سے دیکھا کہ فضا میں اچانک سنہری لکیریں اُبھرنے اور ڈوبنے لگیں، کیونکہ ہاتھ لہرانے سے پارس پتھر فضا میں ہوائی لہروں سے ٹکرا کر طلائی ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

ہمارا انٹرویو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس سے ہمارے اخبار کی اشاعت پر بہت خوشگوار اثر پڑا اور ہمارے ساتھی اخباری نمائندوں کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ مگر مسٹر گوموٹومو سے تردید یا تصدیق اُن کے بس میں نہ تھی۔

خیر بس میں تو میں بھی نہیں ہوں میری تو اب بھی رات کی نیند حرام ہے، ابھی ابھی مجھے ایک اور "ڈی۔ آئی۔ پی" کا اصلی انٹرویو لینے ریلوے اسٹیشن جانا ہے۔ اس لیے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے چپکے سے اپنے پیشے کا یہ گُر بھی بتاتا چلوں تاکہ بہتوں کا بھلا ہو کہ میں کہیں گیا ویا نہیں تھا اور میں نے یہ انٹرویو صبح ناشتے کے بعد اپنے ڈرائنگ روم میں لکھا ہے۔

اصغر علی — بی، اے

ڈگریوں کے متعلق ہماری معلومات "کرشن چندر، ایم، اے" تک محدود تھی مگر اس میں یہ فیصلہ نہ کر پاتے کہ تخلص کون سا ہے اور نام کون سا ہے!

بہرحال بہ جائے پیدایش ہماری لکھنؤ کی، ہر موڑ پر دس پانچ شاعر اور انہی میں اٹھنا بیٹھنا۔ دیکھا دیکھی ہم نے بھی غزل کہی۔ ایک پرانے استاد کو، جن کی ہم بہت عزت کرتے، شرماتے ہوئے غزل دکھائی۔ غزل استاد کو پسند آگئی۔ خوش ہو گئے۔ سر پر ہاتھ پھیرا، بولے:

"میاں غزل تو خوب ہے۔ اب تو ہو گئے شاعر، مگر کچھ تخلص بھی تو ہونا چاہیے۔"

یہ سوال ہمارے لیے ذرا ٹیڑھا تھا۔ بہت دیر تک سوچتے رہے۔ آخر ہماری سمجھ میں آگیا۔ عرض کیا:

"استاد! بی کام کیسا رہے گا؟"

بولے: "بہشت!"

ہم نے کہا: "آخر استاد! وہ شبلی بی کام بھی تو ہوا کرتے تھے؟"

کہنے لگے۔ "وہ اور بات ہوئی!"

عرض کیا۔ "اچھا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دونوں تخلص آپس میں ٹکرا نہ جائیں تو پھر ہم اپنا تخلص 'بے کام' رکھ لیتے ہیں۔ مگر استاد کی نہ سمجھ میں آنا تھا، نہ آیا۔ وہ مستقل یہی مشورہ دیتے رہے:

میاں تخلص ہی رکھنا ہے تو دل و جگر وغیرہ، جملہ اعضائے رئیسہ میں سے کوئی اپنے لیے چن لو۔ مگر ہم فیصلہ یوں نہیں کر پاتے کہ ڈگری و تخلص کا حساب ہماری سمجھ سے بالاتر تھا، پھر یہ حساب کچھ ہوتا بھی ٹیڑھا ہے۔ بہت عرصے تک یہی فیصلہ نہیں کر پائے کہ پہلے ایم۔اے ہوتا ہے یا بی اے یا دونوں ساتھ ساتھ۔ مگر معلوم ذرا دیر میں ہوا۔ پھر ہم نے مزید معلوم کرنے کی خواہش بھی نہیں کی اور یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ دیر آید درست آید، یعنی ہم کو ڈگری ملی اور وہ بھی اس شان سے کہ پہلے ڈگری علالت سے ملی اس کے بعد یونی ورسٹی سے۔ پہلی ڈگری میں گھربار بالکل گیا اور دوسری میں یونی ورسٹی چھوٹ گئی۔

ہاں تو ان دنوں میں بی۔اے۔ کر چکا تھا۔ اور ملازمت سے تقریباً ناامید ہو کر، خالی وقت گزارنے سے یہی بہتر سمجھا کہ ایم اے ہی کر ڈالوں۔

گرمیوں کی چھٹی میں میرا جانا منشی چچا کے یہاں ہوا۔ منشی چچا اپنے ایک چھوٹے سے ایک موروثی گانو میں رہا کرتے تھے۔ ہماری آپ کی دنیا سے دور، جس کے محدود ماحول میں ان کی اپنی دنیا تھی، جس میں وہ ہر چیز کو آج سے پچاس سال قبل کی عینک لگا کر دیکھا کرتے تھے، ان کو ہر چیز ہر بات اور ہر خیال میں دخل تھا بلکہ دخل کم اور دخل در معقولات زیادہ۔ پھر بھی عموماً دخل زیادہ اور معقولات کم ہوا کرتی تھیں۔

جب اصغر بھائی نے بی اے میں داخلہ لیا تو منشی چچا نے ان کے بی اے کروانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ شروع کے تین چار سال تو اصغر بھائی نے "ٹرائل" میں گزار دیے۔ اس کے بعد انھوں نے سنجیدگی سے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ انھیں ایک نہ ایک دن بی اے ہو جانا ہے، چنانچہ کئی بار مضامین کی ترتیب میں ردّ و بدل ہوا۔ آخر کئی سال کی لگاتار محنت اور تجربے کے بعد انھوں نے بی اے پاس ہی کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اصغر بھائی نے یونی ورسٹی پر اٹھارہ حملے کیے اور سترہ بار پسپا کر دیے گئے۔ مگر انیسواں حملہ سخت تھا۔ اس بار انھوں نے

یونی ورسٹی کو پسپا کر دیا، بلکہ شکستِ فاش دی۔ سچ تو یہ ہے کہ محنت کا پھل میٹھا۔ غرض ہم اپنے بچپن سے جس خبر کو سننے کے لیے بے تاب تھے، وہ خوشخبری ہم کو جوانی میں ملی۔

روایت ہے کہ جس سال انھوں نے بی اے پاس کیا، منشی چچا نے بہت بڑے پیمانے پر دعوتِ عام کی۔ نوبت بٹھائی، شہنائیاں بجوائیں، گھی کے چراغ جلوائے، غریبوں میں غلّہ اور کپڑے تقسیم کیے۔ کچھ دنوں تک تو لوگ مبارک باد دینے گھر آتے رہے، ہر آنے والے سے منشی چچا نہایت تفصیل سے اصغر میاں کے بی۔اے کرنے کے واقعات سناتے۔ پھر اصغر میاں کو بلوا کر آنے والے سے ملواتے۔

"ان سے ملو یہ ہیں اصغر علی بی اے!"

جب کچھ دن بعد آنے والوں کی تعداد گھٹنے لگی اور آخر گھٹتے گھٹتے غائب ہو گئی، تو کچھ دنوں تک منشی چچا نے نہ آنے والوں کی کم نصیبی، جہالت اور ناشکری پہ لعنت بھیجی۔ مگر جب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا تو مجبوراً روزانہ لوگوں کے گھروں گھروں، میلوں نکل جاتے اور ایک ایک کو جبراً گھر سے برآمد کرا کے اصغر میاں کے بی۔اے ہونے کی داستان سناتے۔

منشی چچا کے گانو میں ایک چھوٹا سا اسکول تھا جس کے ہیڈ ماسٹر اصغر علی بی اے ہو گئے۔ اس اسکول کی اہمیت منشی چچا کی نظروں میں یوں بھی زیادہ تھی کہ یہاں دوسروں کے بچے پڑھ کر ترقی کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ انھیں میں کوئی اسپوت بی اے تک پاس کر لے۔

اصغر بھائی کو بی اے ہوئے بھی کئی سال بیت چکے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی تازے تازے بی اے کر کے لوٹے ہوں۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری مڈبھیڑ منشی چچا سے ہوئی۔ دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے، اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ بڑی محبت سے دیر تک ایک ایک کر کے حال چال

دریافت کرتے رہے۔

"میاں کیا کر رہے ہو؟"

"ایم اے کرنے کا ارادہ ہے!"

"ہاں ہاں! ایم اے کر ڈالو، اپنا کھا کما لو گے۔ بی۔ اے وغیرہ تمھارے بس کی بات کہاں:"

میں نے دانتوں تلے ہونٹ دبا لیے اور سانس روک لی، ہنسی تھی کہ رکتی ہی نہ تھی۔ پھر دوسرے بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ "منجھلے میاں تو ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں، چھوٹا انجینئرنگ کے مقابلے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"ارے بھائی! ٹھیک ہے۔ بڑا بُرا زمانہ لگا ہوا ہے۔ اچھا ہے بے چارے ڈاکٹر انجینئر کچھ ہو تو جائیں گے۔ ورنہ بی۔ اے وغیرہ کے چکر میں کہاں پڑتے۔ بھیا مگر میں نے تو لگ لپٹ کے اپنے اصغر میاں کو بی اے کروا دیا!"

اتنے میں اصغر بھائی کے کچھ شاگرد آ گئے۔ منشی چچا نے عینک ناک کی پھنگی سے اٹھا کر ماتھے پر جماتے ہوئے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"میاں تم کس درجے میں پڑھتے ہو؟"

"دسویں میں۔"

"ہاں۔ دسواں جلدی سے کر ڈالو۔ بی اے وغیرہ کہاں تمھارے بس کا روگ ہے۔ تم لوگ ڈلڈا تو کھاتے ہو۔ میں نے جب اصغر میاں کو بی اے پاس کرنے شہر بھیجا تھا تو برابر اصلی گھی کے کنستر بھیجا کرتا تھا، تب جا کے بی اے ہوئے۔"

اتنے میں سامنے ڈاکیہ گزرا۔ منشی چچا نے اس کو پکارا۔

"ارے کوئی خطوط ہو تو دیتے جاؤ۔"

پوسٹ مین ڈاک دیکھنے لگا۔ چچا نے جھنجلا کر کہا۔

"ارے کیا اُلٹ پلٹ رہے ہو؟ جس جس پر بی اے لکھا ہو، سب

دے جاؤ۔ اور ہے کون یہاں بی اے ۔؟"

پھر منشی چچا نے کرسی میرے نزدیک کھسکاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"جانتے ہو میاں؟ کلکٹر صاحب ہمارے اصغر میاں بی اے کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں، ہاتھ ملاتے ہیں۔ خود دس دفعہ گھر دوڑ دوڑ کر آتے ہیں۔ کسی اور سے وہ بات ہی نہیں کرتے، سوائے ہمارے اصغر میاں بی اے کے۔"

منشی چچا نے بات روکتے ہوئے عینک سنبھالی اور پہلو بدلتے ہوئے بولے:

"سُن رہے ہو نا؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں! سُن رہا ہوں۔"

"یہ سامنے والی زمینیں جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ سب تمھاری تھیں۔ پندرہ بیس تو صرف گائے بھینسیں تھیں۔ کئی جوڑ بیل تھے۔ میں نے بھی کہا اس وقت اگر تم نے پیسے کا منھ دیکھا تو دنیا یہی کہے گی کہ روپیہ پیسہ تو اسی دن کے لیے ہوتا ہے۔ روز روز کہاں یہ مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ میں نے بھی آنکھ بند کر کے پیسہ لگا دیا اور اصغر میاں کی قسمت میں ایک دن بی اے ہونا تھا۔ بھیا سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ وہ بی اے ہوئے اور زمین کھیت ہو گئے۔ دشمن تو منھ دیکھتے رہ گئے۔ منھ۔"

اتنے میں اصغر بھائی اندر سے برآمد ہوئے۔ شاگرد کھڑے ہو گئے۔ اصغر بھائی نے بڑے تپاک سے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ نئے پرانے تذکرے چھڑ گئے۔ اصغر بھائی نے لڑکوں کو رخصت کیا۔ گھر کے اندر لے گئے۔ چائے منگوائی، ناشتے کے بعد میرا پروگرام پوچھا۔

"پروگرام ہی کیا، چھوٹے بھائی کے لیے گھڑی اور پتلون وغیرہ شہر جا کر خریدنا ہیں۔" یہ سن کر اصغر بھائی نے برا سا منھ بناتے ہوئے کہا۔

"بھائی سچ پوچھو تو بی اے کرنے سے پہلے یہ گھڑی اور پتلون وغیرہ بالکل نہیں

کھتے۔ میں نے جب تک بی اے نہیں کیا تھا، نہ سوٹ پہنتا تھا نہ دھوپ کا چشمہ لگاتا تھا، نہ بائیسکل استعمال کرتا تھا۔ گھڑی آستین کے اندر کلائی پہ چھپا کر باندھا کرتا تھا۔ مگر جب میں نے بی اے کر لیا تو علانیہ گھڑی کف کے اوپر باندھنے لگا۔ پھر ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اصغر بھائی اسکول چلے گئے۔ منشی چچا پیڑ کے نیچے پالتی مارے بیٹھے جنتری دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی آواز سنائی دیتی۔

"سنا بے کلوا، ہم کہتے نہ تھے اور دیکھ یہ جنتری بھی یہی کہتی ہے یہ ہندوؤں کا سال ہے۔ اس کو کمبھ کہتے ہیں۔ اس سال بندر مارنے والے پر بڑی سختی ہوگی.... ہاں اب کی جوار بونے میں لابھ ہوگا۔ چاہے جوار بوئے یا سونا۔ ..... فتو کی ماں تمھارا چھوکرا خط بھیج دیتا ہے اور جواب ہم کو دینا پڑتا ہے۔ اب کی فصل پر آئے تو کمبخت کو مرغا بنا دوں گا۔ اس سے کہہ دینا کہ جوابی خط بھیجنا چاہیے۔ ..... رمئی ہمارا پیسہ اگر اسی طرح پھنسا رہے تو تمھارا کیا کمال ہوا، تمھارے پنچ ہونے سے ہمارا کیا بھلا، نہیں دیتا ہے تو جوتے مار دیگا کیسے نہیں۔ ...... ہاں بھئی شہر سے آئے ہیں شہر سے، اصغر میاں بی اے کے پاس آئے ہیں........ اور بے لودھ کے بچے پھینک اس کو سارا تمبا کو برباد کر دیا۔ پھر سے حقّہ تازہ کر.... نہیں بھئی نہیں، ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ ہمارا بھتیجہ آیا ہوا ہے۔ ہمارے پاس وقت کہاں۔"

منشی چچا کی باتوں اور کھانسی کی آواز تھوڑی دیر بعد آ رہی تھی۔ میں کھانا کھا کر سفر کی تکان اتارنے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔ زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار میں نے اتنے ہولناک خواب دیکھے۔

یوں محسوس ہوا گویا میری بوسیدہ بی اے کی ڈگری جس پر جگہ جگہ ایمپلائمنٹ ایکس چینج کی مہریں لگی ہوئی تھیں، مجھ سے اپنی ناقدری اور توہین کا بدلہ لے رہی ہے۔ مجھے اپنے تمام ہم جماعت، جنھوں نے میرے ساتھ

بی اے کیا تھا اور میرے ساتھ دفتروں کی ٹھوکریں کھانے اور نوکری تلاش کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، کوئی بھی ڈپٹی کلکٹر سے کم نظر نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ تین چار تو صورت سے منسٹر وغیرہ معلوم ہو رہے تھے۔ میری خوشنما پوشاک پر جگہ جگہ بی اے کی ڈیزائن و نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ پھر جیسے لوگوں کو پتا لگ گیا ہو کہ اس مقام پر ایک بی اے موجود ہے، لوگ جوق در جوق زیارت کے لیے یلغار کر رہے ہوں۔ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ میں اس بھیڑ میں کھو گیا۔ اور مجمع نے میرے اوپر چڑھ کر مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے میرا مزار بن گیا۔ اور زیارت کرنے والے اس خاکسار کے مزار کی زیارت کرنے لگے۔ لوگ بی اے والے بابا کے مزار پر حاضری دے رہے ہیں۔ عرس و قوالیاں ہو رہی ہیں۔ پیسہ برس رہا ہے۔ عورتیں بال کھولے کپڑے چاک کیے میرے مزار پر جھوم رہی ہیں۔ لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ "او بی اے پاس بابا اپنی ڈگری اور علم کے صدقے میں ہماری نہیں تو ہماری سات پشت میں کسی نہ کسی کو ضرور بی اے لگوا دے۔ او پاک بے نیاز ذات تیرے پنجۂ قدرت میں ڈگری ہے ڈگری ۔۔۔" میرے مزار شریف کے کتبہ پر قطعہ تاریخ کے بجائے سنہری حروف میں بیچلر آف آرٹس، چمک رہا تھا۔ یکایک قبر کی تنہائی کے تصور سے بے اختیار پسینے چھوٹنے لگے، گھگھی بندھ گئی۔ مزار شریف سے قوالی کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

"او بی اے پاس بابا
کوئی بہانا کر کے آ جا آ جا۔!"

آنکھ کھلی ما بدولت زمین پر تشریف رکھتے تھے۔ اور نگاہیں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔ گرد جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ جھانک کر دیکھا تو منشی چچا کسی سے اصغر بھائی کو ملوا رہے تھے۔

ان سے ملو یہ ہیں اصغر میاں بی اے۔

چپکے چپکے اپنا سامان باندھا۔ بغلی دروازہ کھولا اور نکل کر سیدھا اسٹیشن بھاگا۔ ٹکٹ خریدا۔ گاڑی پر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی گاڑی چلی سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ گھر پہنچتے ہی اپنی ڈگری اور فریم کرانے کی لاگت منشی چچا کو انشیورڈ ڈاک کر کے بھجوا دیں گے۔ اور اگر کبھی کسی گستاخ نے ہماری علمی قابلیت کے بارے میں دریافت کیا تو کہہ دیں گے:۔

"اجی جھک ماری ہے، گھاس کھودی ہے، جوتیاں چٹخائی ہیں۔
آپ کی بلا سے ــــــ"

مسٹر ہاں ہاں!

اِن کی بے محل مسکراہٹ پر کبھی غصہ آتا ہے، کبھی پیار۔ وہ ہر بات سے پہلے، درمیان اور آخر میں کھنکارتے ہیں۔ اِن کا تکیہ کلام "ہاں ہاں!" ہے، جو اب تکیے سے بڑھ کر تکلم میں تبدیل ہو چکا ہے۔

کسی دل جلے نے انھیں مسٹر ہاں ہاں کا خطاب دے دیا، جسے انھوں نے تسلیم بھی کر لیا۔ ہوا یوں کہ کسی نے پوچھا۔

"مسٹر ہاں ہاں کیا آج نہیں آئے؟" دوسرے کمرے سے وہ چیخ کر بولے۔

"ہاں ہاں! آیا تو ہوں، یہاں بیٹھا ہوں۔" اس کے بعد یہ تو نہ چلے، مگر ان کا نیا نام چل گیا۔

اگر یہ کبھی ہنہنا کر آپ پر "ہاں ہاں" کرتے ہوئے حملہ آور ہوں تو سمجھ جائیے کہ آپ سے کوئی بے حد ضروری مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر نہ یہ، کبھی کسی کے قیمتی سے قیمتی مشورے پر عمل کر سکتے ہیں، نہ بلا مشورہ لیے رہ سکتے ہیں۔

انھوں نے صبح اٹھنے کے فوائد پر جس دن مشورہ لیا تھا، شام تک پلنگ پر خراٹوں کے ساتھ اس پر غور کر رہے تھے۔ جس سال امتحان سے ڈراپ نہ کرنے کا مشورہ لیا تھا، اس سال امتحان میں بیٹھے ہی نہیں تھے۔

مسٹر ہاں ہاں کو اپنی ذات بے برکات سے بے پناہ عشق ہے، جس کے لیے

وہ بڑے پاپڑ بیلتے ہیں اور اکثر عزت سادات (اگر کچھ ہے تو) تک کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں۔

ان کی ساری توجہ اپنے بناؤ سنگھار پر مرکوز رہتی ہے۔ اگر یہ راشن لینے جائیں اور کریم پاؤڈر خرید کر لوٹ آئیں تو اس میں تعجب کی بات صرف اس لیے ہوگی کہ کریم کی شیشیاں درجن کے حساب سے اٹھالائے۔ جس سے متاثر ہوں گے، اُسے تحفتاً بھی پیش کر دیں گے۔ اگر فروخت کرتے نظر آئیں تو سمجھ جائیے کہ مالی مصائب کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

چونکہ شادی شدہ عاشق ہیں اس لیے ان کے اخراجات عشق سے، بیوی، بچے ہمیشہ شدید متاثر رہتے ہیں۔ ان کو یقینِ کامل ہے کہ بال بچے تو ہوا میں بھی پَل سکتے ہیں، مگر پالنے والا بلا بنے سنورے نہیں پل سکتا۔ اس لیے یہ انتہائی غیر جانبداری کے ساتھ اپنے آپ کو پالنے پوسنے میں سال بھر سرگرداں رہتے ہیں۔

ایک انتہائی معتبر راوی کے مطابق پچاس سالہ گھریلو زندگی اور گھر گرہستی پر اب تک وہ کئی چونیاں خرچ کر چکے ہیں جنھیں وصول نہ کر سکنے کے غم نے ان کی شخصیت میں ایک سوز پیدا کر دیا ہے۔ ایسی گمبھیرتا، جو احساسِ فرض کے خیالی بوجھ کے دباؤ سے ابھرتی ہے۔

پُرسوزی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ کبھی اپنے موجودہ پیشے سے مطمئن نہیں رہتے۔ جب پڑھتے تھے تو بچپن کو بیٹھے بیٹھے کر یاد کرتے "ہائے وہ لڑکپن کی آزادیاں" ملازمت میں داخلے کے ساتھ ہی طالب علمی کے زریں دور کی سنہری یادوں نے ان کی مٹی مستقل طور پر پلید کر دی۔

جب وہ کسی اسکول سے وابستہ بلکہ معلق تھے، تو کاروبار سے عشق تھا، روزانہ کسی نہ کسی دھندے کی خوبیاں تلاش کرتے نظر آتے۔ کالے دھن کی برکتوں سے متاثر ہو کر بمبا کو کے کاروبار میں داخل ہوئے تو پرانی

ملازمت کو اتنا یاد کیا کہ ہاتھ کالے ہونے سے پہلے ہی دکان میں تالے لگ گئے۔

طبیعت خواص پسند ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات کی یک طرفہ ٹریفک، اونچی اونچی حویلیوں اور کوٹھیوں تک جاری رہنے کے باوجود، یہ دنیا میں یکہ و تنہا (یکہ کے گھوڑے کی طرح تنہا) ہیں۔ یعنی یہ بہت سوں کے دوست ہیں، مگر حیف صد حیف کہ ان کا کوئی دوست نہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

علی برادران اور ان کا زمانہ	(تذکرہ)	سید محمد ہادی	۱۵-۵۰
نئی شعری روایات	(تحقیق)	شمیم حنفی	۲۱-۰
ایک مہم — دو دل	(ناول)	خالدہ رحمان	۱۰-۰
چشم حیراں	(مزاحیہ مضامین)	احمد جمال پاشا	۷-۵۰
پانچ، چھ ڈرامے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۶-۰
پروائی	(ناول)	صغرا مہدی	۸-۰
شام شہر یاراں	(شعری مجموعہ)	فیض احمد فیض (مجلد)	۱۰-۰
عشق اور بھکتی	(تحقیقی)	عماد الحسن آزاد فاروقی	۹-۰
اقبال اور دلی	(تحقیقی)	عبدالقوی دسنوی	۹-۵۰
اقبال — دانائے راز	(تحقیقی)	عبداللطیف اعظمی	۱۵-۰
انگوٹھے کا نشان	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۷-۰
گوری سوئے سیج پر	(ناول)	صالحہ عابد حسین	۹-۰
تذکرہ معاصرین (۳)	(تذکرہ)	(مرتبہ) مالک رام	۳۲-۰
جستہ جستہ	(شعری مجموعہ)	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۱۸-۰
جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	(تنقیدی و تحقیقی)	ڈاکٹر شمیم حنفی	۲۵-۰
گل افشانیٔ گفتار	(شعری مجموعہ)	نشور واحدی	۵-۰
شاد عارفی شخصیت اور فن	(تحقیقی)	ڈاکٹر مظفر حنفی	۲۴-۰
رابطہ عامہ	(پبلک ریلیشن)	عرفان صدیقی	۵-۰
علی گڑھ سے علی گڑھ تک	(تذکرہ)	اطہر پرویز	۱۲-۰
دبستان آتش	(تحقیقی)	شاہ عبدالسلام	۱۶-۰
سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ	(تحقیقی)	عتیق صدیقی	۲۰-۰
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل	(مذہب)	مجیب اللہ ندوی	۱۴-۰
ریڈیو ڈرامے کا فن	(تحقیقی)	اخلاق اثر	۱۸-۰
نئی دھرتی، نئے انسان	(افسانے)	خواجہ احمد عباس	۱۲-۰
پرائی دھرتی، اپنے لوگ	(ناول)	جیتندر بلو	۱۲-۰
شگوفہ زار	(لطائف)	خواجہ عبدالغفور	۱۶-۰
اردو گیت	(تحقیقی)	ڈاکٹر قیصر جہاں	۱۲-۵۰
مفتی صدرالدین آزردہ	(تحقیق)	پرواز اصلاحی	۱۲-۰
ایک مٹھی ہندوستان	(ناول)	سید شمیم اشرف	۹-۰
آئمہ اربعہ	(سوانح)	مولانا ابوالعرفان ندوی	۲-۲۵
فسانۂ غالب	(تحقیقی)	مالک رام	۱۶-۵۰
درد و درماں	(افسانے)	صالحہ عابد حسین	۱۲-۲۵
مسلمان اور وقت کے تقاضے	(مذہب)	مولانا عبدالسلام قدوائی	۸-۰
انشائیات	(مضامین)	ڈاکٹر عابد حسین	۱۵-۰
تذکرۂ معاصرین (۲)	(تذکرہ)	(مرتبہ) مالک رام	۱۲-۰
حیات اسماعیل میرٹھی	(تحقیقی)	ڈاکٹر سیفی پریمی	۱۸-۰
نوائے آوارہ	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۸-۵۰
کرب آگہی	(شعری مجموعہ)	آنند نرائن ملا	۱۰-۵۰
کو بہ کو	(شعری مجموعہ)	سلمان اختر	۷-۰
پچھلے پہر	(شعری مجموعہ)	جاں نثار اختر	۷-۰
بیاض مریم	(شعری مجموعہ)	سکندر علی وجد	۱۲-۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۱۹۶۹۲